ہوئے نام دوست جس کے
مجتبیٰ حسین

www.taemeernews.com

ہوئے ہم دوست جس کے

(شخصی خاکے)

مجتبیٰ حسین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

www.taemeernews.com

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

HUWEY HUM DOST JISKEY
(Shakhsi Khake)

by

Mujtaba Husain

Year of Ist Edition 1999
Year of Latest Edition 2011
ISBN 978-81-8223-891-6
Price Rs. 120/-

نام کتاب	:	ہوئے ہم دوست جس کے (شخصی خاکے)
مصنف	:	مجتبیٰ حسین
اولین اشاعت	:	۱۹۹۹ء
تازہ اشاعت	:	۲۰۱۱ء
قیمت	:	۱۲۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔ ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

www.taemeernews.com

شیطانِ ظریف

حمایت اللہ

کے نام

جس کا دامن 'ظرافت' اور 'شرافت'

کی نیکیوں سے مالامال ہے

www.taemeernews.com

ترتیب

☆☆☆

www.taemeernews.com

گزارشِ احوالِ واقعی

لگ بھگ نصف صدی پہلے میں نے اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' کے حکم کی تعمیل میں، محض اتفاقی طور پر، 12 اگست 1962 کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے مزاح نگاری شروع کی تھی۔ اس کا آغاز فرضی نام کے ساتھ فکاہیہ کالم نگاری سے ہوا۔ دو چار برس بعد جب اپنے اصلی نام کے ساتھ لکھنے کی ہمت پیدا ہوئی تو انشائیوں، شخصی خاکوں، سفرناموں، رپورتاژ اور نہ جانے کن کن اصناف و اسالیب کو مشرف بہ مزاح کیا۔ چنانچہ اتنے لمبے ادبی سفر کے بعد اب مزاح نگاری ہی میری واحد پہچان بن گئی ہے۔ کیا بننا تھا اور کیا بن گئے۔ اب تو کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں بچا۔ یوں بھی اس حسنِ اتفاق کا خیال آتا ہے تو ہنسی ہی آجاتی ہے کیونکہ ایک آدمی جب ہنسنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے تو تقدیر کے جبر کے نتیجہ میں صورتحال بہرحال مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔

1968 میں میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''تکلف برطرف'' شائع ہوا تھا جسے ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد میں حیدرآباد سے میری جتنی بھی کتابیں چھپیں اُن کی اشاعت کا اہتمام میرے دوستوں بالخصوص میرے مزاح نگار دوست مسیح انجم مرحوم نے کیا۔ اپنے لا اُبالی پن کی وجہ سے میں نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے معاملہ میں کبھی شخصی دلچسپی نہیں لی۔ مجھے اس بات کا احساس تو تھا کہ ان کتابوں کی کتابت و طباعت کا معیار وہ نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ یوں بھی 1972 میں دہلی منتقل ہوجانے کے بعد میری بے ہنگم مصروفیات نے کبھی اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں اس جانب توجہ کرسکوں۔

1989 میں جب میں پہلی بار پاکستان گیا تو میرے کرم فرما مشفق خواجہ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا ''تمہارا کمال یہ ہے کہ ناقص طباعت و کتابت والی ان چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ تم نے مزاح نگاری میں بڑا نام کمایا ہے، سچ پوچھو تو تمہاری بعض کتابوں کی ناقص طباعت کا یہ عالم ہے کہ یہ کتابیں مطبوعہ ہونے

www.taemeernews.com

کے باوجود مجھے تو غیر مطبوعہ ہی نظر آتی ہیں"۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا "یا خواجہ ادیب نواز! میں نے جان بوجھ کر ان کتابوں کی طباعت کے معیار کو بلند نہیں ہونے دیا تاکہ قارئین کو میری مزاح نگاری کے معیار کی بلندی کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے۔ طباعت کا معیار اچھا ہو تو لوگ کتابوں کو روا روی میں سرسری طور پر پڑھ لیتے ہیں۔ چھپے ہوئے متن کی تہہ داریوں اور باریکیوں کی طرف اُن کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ قاری کی گہری توجہ اور پورے انہماک کو حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ کتاب کی طباعت کا معیار ناقص ہو"۔

اُس وقت تک میری دس بارہ کتابیں چھپ چکی تھیں جو نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ ان کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔ بالآخر 2000 میں امریکہ میں مقیم میرے بزرگ دوست حسن چشتی نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے تعاون سے میری کتابوں کو طباعت کے اعلیٰ معیاروں کے ساتھ چھاپنے کا منصوبہ بنایا اور چار ضخیم کتابیں شائع کروادیں۔ بعد میں سید امتیاز الدین، احسان اللہ احمد اور رحیل صدیقی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور اب تک اس سلسلہ کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پچھلے دنوں برادرم محمد مجتبیٰ خان، مالک ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے مجھے بتایا کہ میرے بیشتر قارئین اب بھی میری اُن پُرانی کتابوں کو پوچھتے رہتے ہیں جو اب نایاب ہو چکی ہیں۔ کیوں نہ ان کتابوں کو طباعت کے عصری معیار اور تقاضوں کے مطابق چھاپ دیا جائے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب مجتبیٰ خان کی اسی تجویز کے نتیجہ میں شائع ہو رہی ہے۔ گویا اب میری ساری کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی معرفت قارئین کو دستیاب ہو سکیں گی۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں کی طباعت کے معیار میں اضافہ کے باوجود میری مزاح نگاری کا معیار (اگر ہے تو) برقرار رہے گا۔

مجتبیٰ حسین

23/اکتوبر 2010

B -107, ROYAL ORCHID
RED HILLS
HYDERABAD-500001

☆☆

www.taemeernews.com

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ یہ بات آپ اور ہم تو اس لیے مان لیں گے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن شاید خود ڈاکٹر گوڑ اس بات کو نہ مانیں کیوں کہ راج بہادر گوڑ کسی بھی بات کو اتنی آسانی سے نہیں مانتے۔ مجھے اس وقت اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آ گئے جنہوں نے ساری زندگی ہنستے کھیلتے، دھوم مچاتے ہوئے گذاردی۔ نوے سال کی عمر میں بھی ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کھلی رہتی تھی جو عموماً نوسال کے بچے کے ہونٹوں پر دکھائی دیتی ہے۔ سچی اور خالص مسکراہٹ۔ مگر جب وہ اکیانوے برس کے ہو گئے اور میں ان کی سال گرہ پر مبارکباد دینے گیا تو اداس سے نظر آئے۔ اداسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "میاں! زندگی کے اکیانوے برس تو چٹکی بجاتے میں گزاردیے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔"......اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جملہ کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ مزید چار برس تک زندہ رہنے کی گنجائش نکالتے رہے۔ اصل میں انسان کی عمر کیلنڈروں سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے جذبہ اور احساس کی سطح پر عمر کی اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں ان میں مزید جوان بنے رہنے کی خاصی گنجائشیں موجود ہیں۔ میرا اپنا حال بلکہ حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بزرگ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ حالانکہ ڈاکٹر گوڑ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں میں نے غالباً اس وقت دیکھا تھا جب میں خود نو برس کا تھا۔ یہاں غالباً کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے شہر گلبرگہ میں رہتا تھا اور اپنے بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار حیدرآباد آ جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی حیدرگوڑہ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ایک

www.taemeernews.com

رات مجھے بلا کر تاکید کی گئی کہ میں مکان کے اس کمرہ میں بالکل نہ جاؤں جو مکان کے پچھلے حصہ میں واقع تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہاں ایک مہمان آیا ہوا ہے اور اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے تو جواب میں یہ کہہ دوں کہ کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ ایسے مہمان کو دیکھنے کی تمنا بھلا کس بچہ کے دل میں پیدا نہیں ہوگی۔ لہٰذا سخت تاکید کے باوجود میں نے چوری چھپے درازوں میں سے جھانک کر اس مہمان کو دیکھا۔ آرام تو خیر وہ کیا کرتا کچھ لکھنے پڑھنے میں ضرور مصروف تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مونچھیں شاید تھیں جو پتہ نہیں اصلی تھیں یا نقلی۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے دیگر کمیونسٹ ساتھی تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنے ٹھکانے بدل بدل کر اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں نے اوپر جس مہمان کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے گھر میں رہا تو صرف ایک ہی دن لیکن اس کے گھر سے چلے جانے کے پانچ چھ برس بعد کسی نے بتایا کہ اس دن جو مہمان ہمارے گھر میں رُکا تھا اس کا نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں چودہ پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر گوڑ جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بڑے فخر کے ساتھ اس وقت بھی بتایا کرتا تھا اور آج بھی بتایا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوڑ نے کبھی ہمارے گھر میں بھی پناہ لی تھی۔ اگرچہ میں آج بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج سے پچاس برس پہلے جس مہمان نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی کیا وہ سچ مچ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہی تھے۔ میں چاہتا تو پچھلے پچاس برسوں میں اپنے بڑے بھائیوں سے اس کے بارے میں پوچھ سکتا تھا بلکہ خود ڈاکٹر گوڑ سے اس کی توثیق حاصل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی نہیں پوچھا اور آج بھی پوچھنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ جواب نفی میں ملے تو میری زندگی میں سے ان سے رابطہ کے عرصہ میں اچانک پانچ چھ برسوں کی کمی واقع ہو جائے گی اور میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں سینت سینت کر جمع کیے ہوئے لمحوں کو تفریق کے عمل سے گزارنا میرے لیے گھاٹے کا سودا ہوگا۔ فراق نے کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے بارے میں کہا تھا۔

www.taemeernews.com

خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

قصہ دراصل یہ ہے کہ راج بہادر گوڑ میرے لیے افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ معاملہ صرف میرا ہی نہیں ہر اس شخص کا ہے جس نے ملک کی آزادی سے پندرہ سولہ برس پہلے سابق ریاست حیدرآباد کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ شخصی حکمرانی کے اس دور میں جب اچھے اچھوں کے منہ بند رہتے تھے، مخدوم محی الدین، روی نارائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک نے اس وقت کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ مخدوم محی الدین کا ترانہ

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اس وقت کے نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد مخدوم محی الدین کا جو جلوس نکلا تھا اس سے بڑا جلوس میں نے آج تک نہیں دیکھا بلکہ جوں جوں میری عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے میرے حافظہ میں اس جلوس کی لمبائی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ دونوں کسی افسانہ کے کردار لگتے تھے۔ ان لوگوں کی روپوشی کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ جنہیں سن کر احساس ہوتا تھا کہ یہ اس دھرتی کے باسی نہیں ہیں۔ مثلاً مخدوم نے ایک بار اپنے ایک برہمن دوست کے گھر میں پناہ لی۔ ان کا برہمن دوست تھا تو کمیونسٹ پارٹی کا ہمدرد لیکن اس کے والدین رہن سہن اور کھانے پینے کے معاملے میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ مخدوم کے دوست نے مخدوم کو سمجھا رکھا تھا کہ اس کے والدین کو ہرگز یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مخدوم اس پر سختی سے عمل بھی کرتے رہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر ان کے دوست کے والد نے باتوں باتوں میں مخدوم سے کہا "تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے دین و ایمان کا کیا بھروسہ۔ کہیں تم لوگ

www.taemeernews.com

گوشت وغیرہ تو نہیں کھاتے؟''

اتنا سنتے ہی مخدوم نے منہ میں جاتے ہوئے نوالے کو روکا اور کہا ''نعوذ باللہ، لاحول ولاقوۃ! چھی چھی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم گوشت کھاتے ہیں۔''

ڈاکٹر گوڑ بھی کئی نام اور کئی بھیس بدل کر روپوش رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ بھی غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ راج بہادر گوڑ ایسی ہی کسی ''نعوذ باللہ'' والی بات پر دھر لیے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں پہنچ کر انہوں نے کسی بیماری کا بہانہ بنایا۔ (میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کا اتنا فائدہ تو وہ اٹھانا جانتے ہی تھے)۔ پھر یہ اکیلے بیمار نہیں پڑے بلکہ اپنے ایک ساتھی کامریڈ جواد رضوی کو بھی ساتھ لے کر بیمار پڑے (حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو اسی کو کہتے ہیں) نتیجہ میں دونوں قیدی علاج کے لیے عثمانیہ اسپتال لائے گئے۔ اپنا علاج کرنا وہ خود تو جانتے ہی تھے۔ لہٰذا دونوں کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اسپتال سے فرار ہو گئے کہ ان کے فرار ہونے کے ڈرامہ کا ذکر کئی دنوں تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہوتا رہا۔ ہماری فلموں میں بھی قیدی اس طرح فرار نہیں ہوتے جیسے یہ دونوں ہوئے تھے۔ میری نسل کے لوگوں کے ذہنوں میں مخدوم اور راج بہادر گوڑ ایک عرصہ تک افسانوی کردار کی طرح ہی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب یہ رہا ہوئے اور جب پہلی بار انہیں اصلی روپ میں دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ کیا یہی وہ راج بہادر گوڑ ہیں جن کے قصے الف لیلیٰ کی داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل راج بہادر گوڑ تو وہی تھے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے ہم جس ڈاکٹر گوڑ کو دیکھ رہے ہیں وہ دراصل ایک بھیس بدلی ہوئی شخصیت ہے۔

معزز حضرات! آج کی محفل میں ہم جن بزرگ کی پچھتر ویں سالگرہ منا رہے ہیں ذرا آپ ان کے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ کیا کبھی ان ہاتھوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے۔ ان کے قریبی جاننے والے کہتے ہیں کہ ان ہاتھوں نے ضرور ہتھیار اٹھائے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھائے تھے۔ میرے پاس ایک نہایت بوسیدہ اور پرانی گھڑی تھی۔ ایک بار وہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ میں اسے ٹھیک کرانے کے لیے

www.taemeernews.com

گھڑی ساز کے پاس گیا۔گھڑی ساز نے پہلے تو اسے حقارت سے دیکھا اور پوچھا۔''کیا ہوا ہے اسے؟''میں نے کہا''یہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرگئی تھی۔''گھڑی ساز نے کہا۔''جب یہ زمین پر گرگئی تھی تو آپ نے اسے اٹھایا ہی کیوں۔وہیں پڑی رہنے دیتے۔''ایسی ہی بات ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ کو ہتھیار ڈالنے ہی تھے تو انہیں اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی۔پھر ذرا سوچیے کہ کیا ان ہاتھوں نے کبھی کسی پر گولی چلائی ہوگی۔اور اگر چلائی بھی ہوگی تو کیا گولی نشانہ پر لگی ہوگی۔آج ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان کہانیوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا جو ان ہاتھوں سے منسوب رہی ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب مجھے جاپان جانے کا موقع ملا تو ڈاکٹر گوڑ کے تعلق سے میری غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔جاپانیوں کے ہاتھ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔میں ان کے ہاتھوں کو دیکھتا جاتا تھا اور گھنٹوں حیرت میں مبتلا رہتا تھا کہ کیا سچ مچ ان ہاتھوں نے دوسری جنگ عظیم میں گولیاں چلائی تھیں اور بم پھینکے تھے۔قصہ دراصل یہ ہے کہ تاریخ مختلف ادوار میں ہاتھوں سے مختلف کام لیتی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔چنانچہ تاریخ نے ڈاکٹر گوڑ کے ہاتھوں سے اب ہتھیار چھین لیے ہیں اور ان میں ایک قلم تھمادیا ہے تاکہ وہ اسے چلاتے رہیں۔اس سے پہلے قدرت ان کے ہاتھوں میں اسٹیتھسکوپ تھمانا چاہتی تھی جسے پھینک کر انہوں نے ہتھیار اٹھالیے تھے۔

مجھے اس وقت اپنے ایک دوست کی یاد آرہی ہے جو نہایت کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ان کے ذمہ کام یہ تھا کہ راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھیار فراہم کرتے رہیں۔ایک بار یہ اسلحہ لے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔بعد میں پولس نے ایسی کڑی تفتیش کی کہ بیچارے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔اس واقعہ کے کئی برس بعد انہیں علاج کے لیے سوویت یونین روانہ کیا گیا جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مرمت کی گئی۔وہ علاج سے مطمئن ہوکر خوش خوش واپس تو ہوگئے لیکن چند ہی برسوں میں خود سوویت یونین کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ان پچھتر برسوں میں نہ جانے کتنوں کی ریڑھ

www.taemeernews.com

کی ہڈیاں ٹوٹیں لیکن ہمارے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی صحیح وسالم ہے۔ ورنہ ہمارے کتنے ہی محبوب تھے جن کا حشر نہ جانے کیا ہوگیا۔ ایک شعر یاد آ گیا۔

زمانہ کس قدر پامال کردیتا ہے انساں کو

ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

اصل میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے لمحۂ موجود میں پوری شدت کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ہم جیسے تو ابھی سے ساحل پر بیٹھ کر زندگی کے منجدھار کا تماشہ دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن راج بہادر گوڑ ہیں کہ اب بھی اس منجدھار میں بہتے چلے جارہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے پورے پچاس برس بیت گئے۔ پچاس برس پہلے ان میں جو چیز دیکھی تھی وہ آج بھی ان کی ذات میں موجود و محفوظ ہے اور اس شئے کو سیماب صفتی کہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔ نتیجہ میں ان کے مزاج میں بلا کی تیزی، چستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ جلد بازی اور عجلت ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کے اواخر میں ایک دن صبح صبح چھ بجے میرے گھر کے آس پاس اچانک کسی کے پکارنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کوئی بڑی تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ تک آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ میرا مکان چوتھی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی رفتار اور میرا نام پکارنے کی تکرار سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھونچال سا آنے والا ہو۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنی کزن سسٹر اودیش رانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بولے "ابے مسخرے اتنی دیر تک سوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک زمانہ تک سُرخ سویرے کے آنے کی امید میں بہت جلدی بیدار ہوجایا کرتا تھا۔ یہ تو نہیں آیا۔ اب جلدی جاگ کر کیا کروں گا۔"

یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی پر ایک ہلکی سی چوٹ تھی جسے وہ بار بار سہلا رہے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہوگیا؟"

بولے "تمہارے گھر کے زینے کو تیزی سے طے کرنے کی کوشش میں میری

www.taemeernews.com

پیشانی ریلنگ سے ٹکرا گئی اور کچھ نہیں۔''

میں نے کہا ''آپ کو اتنی عجلت سے سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

بولے ''ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اودیش رانی نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ چنانچہ آج سے پانچ دن بعد ان کے دولہا میاں آنے والے ہیں اور چھٹے دن ہر حالت میں ان کی شادی ہوجانی چاہیے۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شادی میں شرکت نہ کرسکوں گا۔ لہٰذا 'کورٹ میرج' کے سارے امور تمہیں کو طے کرنے ہوں گے۔ کنیادان بھی تمہیں کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا ''گوڑ بھائی! یہ تو سب ہوجائے گا، مگر آپ کو سیڑھیاں چڑھنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی اودیش رانی کی عمر اب پچاس برس کی ہوگئی ہے۔ جہاں اتنی تاخیر ہوئی ہے وہاں پانچ دس منٹ کی اور تاخیر ہوجاتی تو کیا فرق پڑتا۔''

ہنس کر بولے ''پیارے! پچاس برس کی عمر ہوگئی ہے اسی لیے تو عجلت نہایت ضروری تھی ورنہ تیس بتیس برس کی عمر ہوتی تو مزید سال دو سال انتظار کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً واپس جانے لگے۔ میں نے انھیں بہت روکا کہ ناشتہ کرکے جائیں لیکن وہ بالکل نہیں رکے۔ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے چلے بھی گئے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ایک اور خرابی نما خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد چھوٹے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھنے کی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے آدمی کا بڑا پن کتنا کھوکھلا ہوتا ہے۔ یہ جب کسی کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو ڈاکٹر گوڑ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا۔ میری مزاح نگاری کے بارے میں اس وقت تک کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر ان کا مضمون سن کر میں ہکا بکا

www.taemeernews.com

سارد گیا کیونکہ انہوں نے میری مزاح نگاری میں جو خوبیاں تلاش کی تھیں وہ خود مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ چنانچہ جلسہ کے بعد میں نے ان سے شکایت کی کہ "حضور آپ نے میری بہت زیادہ تعریف کر دی جس کا میں مستحق نہیں تھا۔"

بولے "میاں! اس کو تعریف نہیں کہتے۔ ہمت افزائی کہتے ہیں ہمت افزائی۔"

میں نے کہا "مگر مجھ میں اتنی ہمت افزائی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

ہنس کر بولے "اپنی ذات میں تھوڑی سی خوش فہمی پیدا کر لو تو یہ ہمت بھی آ جائے گی۔"

چنانچہ ڈاکٹر گوڑ کا یہ مضمون اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جسے میں اکثر اوقات اپنے آپ میں خوش فہمی پیدا کرنے کے خیال سے پڑھ لیتا ہوں اور میری نااہلی دیکھیے کہ یہ خوش فہمی آج تک مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہ نہ سمجھیے کہ ڈاکٹر گوڑ نے میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیا تھا۔ پچھلے تین چار دہوں میں ڈاکٹر گوڑ نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے اور حتی المقدور انہیں خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے۔ ہر کوئی میری طرح نااہل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں لیکن اس وقت مجھے ایک سال پہلے دسمبر کی ایک شام یاد آ رہی ہے۔ حیدرآباد میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں ڈاکٹر گوڑ سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ بابری مسجد کو گرے ہوئے سات آٹھ دن ہی بیتے تھے۔ ڈاکٹر گوڑ نے آتے ہی میزبان سے کہا "بھئی کھانا جلدی لگوا دو۔ میں زیادہ دیر تک نہیں رک سکتا۔"

میں نے کہا "گوڑ بھائی! یہ آپ نے کب سے کھانے میں دلچسپی لینی شروع کر دی؟"

بولے "نہیں! مجھے پرانے شہر میں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

میں نے پوچھا "کوئی ادبی محفل ہے؟"

بولے "دیکھ نہیں رہے ملک میں کیا ہو رہا ہے اور تمہیں ادبی محفل کی سوجھ رہی ہے۔ پرانے شہر میں ایک میٹنگ ہے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف۔"

میں نے کہا "گوڑ بھائی! بابری مسجد کے انہدام کے خلاف آپ کیا کہیں گے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن یہ بتائیے کہ آج کے حالات میں کون آپ کی عقلمندی اور

www.taemeernews.com

ہوشمندی کی باتیں سنے گا۔"

غصہ سے بولے۔"کسی کو نہ سننا ہو تو نہ سنے۔مگر مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہتا رہوں گا۔اگر کوئی مجھے نہیں سننا چاہتا تو میں خود اپنے آپ کو اپنی باتیں سناتا رہوں گا۔"

ایسے موڈ میں ان سے بحث کرنا اچھا نہیں ہوتا۔میں نے عافیت اس میں جانی کہ اپنے حلوے مانڈے سے مطلب رکھوں۔

ڈاکٹر گوڑ نے آج سے پچاس پچپن برس پہلے جس عقیدہ اور مسلک کو اپنایا تھا اس پر آج تک اسی طرح قائم ہیں۔انسان دوستی،محبت، پیار اور رواداری کا مسلک......دنیا میں کیا نہیں ہوا لیکن یہ بدستور اپنے مسلک کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔دامن بھلے ہی چاک ہو گیا ہو لیکن انہوں نے اپنے مسلک کو چاک نہیں ہونے دیا۔کبھی کبھی ڈاکٹر گوڑ مجھے ایک ایسے عوامی رہنما نظر آتے ہیں جو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ہجوم کی تنہائی کو جو لوگ محسوس کر سکتے ہیں وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ پائیں گے۔میں انہیں سچے،مخلص، بےلوث اور بےغرض رہنماؤں کی نسل کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔

اگر میں صاحب اقتدار ہوتا تو ایسے بچے کھچے رہنماؤں کی ایک سینکچوری Sanctuary بناتا تا کہ یہ وہاں محفوظ رہیں اور ہمارے موجودہ رہنما انہیں دیکھ لیا کریں۔کوئی سبق تو وہ خیر کیا حاصل کر پائیں گے مگر انہیں دیکھ لینے میں کیا قباحت ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟۔مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انہیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں اور ہم میں وہ خوش فہمی پیدا کرتے رہیں جس کے بغیر آج کے دور میں زندہ رہنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔ (۱۹۹۳)

☆☆☆

www.taemeernews.com

شمس الرحمٰن فاروقی

اُردو ادب کی سب سے منفرد اور ممتاز شخصیت، شمس الرحمٰن فاروقی کے بارے میں ماہنامہ ''کتاب نما'' نے پچھلے ہفتہ ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے جس کی رسم اجرا کے سلسلہ میں دہلی میں ایک خوبصورت ادبی محفل بھی آراستہ کی گئی جس میں خود شمس الرحمٰن فاروقی نے بہ نفس نفیس شرکت کی۔ تقریب میں شمس الرحمٰن فاروقی کی شرکت کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ فاروقی ایسی رسمی محفلوں میں ذرا کم ہی شرکت کرتے ہیں۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے جب شمس الرحمٰن فاروقی نے خود اپنے بارے میں منعقد ہونے والے ایک جلسہ میں شرکت کر کے اپنے آپ کو عزت بخشی ہے (فاروقی اپنی ذات کو ایسے اعزاز ذرا کم ہی عطا کرتے ہیں) ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ ہم نے بیسیوں ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے لکھے لیکن کبھی شمس الرحمٰن فاروقی کا خاکہ نہیں لکھا حالانکہ ان سے تعلق خاطر نہایت پرانا ہے۔ ان سے ہماری بے تکلفی بھی ہے اور ہم دونوں کی عمروں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے لیکن ان کے بیش بہا علم اور ادبی مرتبہ کی وجہ سے ہم نے انہیں ہمیشہ اپنا بزرگ مانا۔ پھر شمس الرحمٰن فاروقی وہ پہلے ناقد ہیں جنہوں نے ۱۹۶۷ء میں جب کہ ہمارے چھ سات مزاحیہ مضامین ہی شائع ہوئے تھے، ہماری مزاح نگاری کے بارے میں رائے دیتے ہوئے حیدرآباد کے ماہنامہ ''صبا'' میں لکھا تھا۔ ''ایسا لطیف مزاح اور ایسی شستہ زبان اردو میں آج شاذ ہی کسی کو نصیب ہوئے'' ان کی اتنی اچھی رائے کے باوجود ہمیں نہ جانے کیوں ان کی رائے کو تسلیم کرنے میں عرصہ تک تامل رہا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ۶۰ ء کی دہائی کے بعد ادب میں جمود وغیرہ طاری ہوگیا تھا۔ ترقی پسند تحریک اور نظریاتی تنقید کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ ادبی جمود کے اس ٹھہرے ہوئے سمندر کی سطح پر شمس الرحمٰن فاروقی نے چپکے سے جدیدیت کی ایک کنکری پھینکی اور کچھ اس طرح پھینکی کہ ادب میں ایک ہلچل سی

www.taemeernews.com

پیدا ہوگئی۔ پھر اس ہلچل میں مزید شدّت پیدا کرنے کے لیے فاروقی نے ۱۹۶۶ء میں الہ آباد سے اپنا رسالہ ''شب خون'' جاری کیا۔ تب سے اب تک شمس الرحمٰن فاروقی اور ان کا رسالہ ''شب خون'' دونوں ادب کے معاملات میں سرگرم عمل ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس شوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے گورکھپور کے ایک جلد ساز سے دوستی کرلی تھی۔ چنانچہ جب بھی کوئی کتاب جلد بندی کے لئے جلد ساز کے پاس آتی تو فاروقی پہلے اس کتاب کو پڑھتے تھے اور تب کہیں جلد ساز اس کی جلد بندی کرتا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ فاروقی کو جب کوئی کتاب پسند نہ آتی ہوگی تو وہ جلد ساز سے کہہ دیتے ہوں گے کہ بھیا اس کتاب کی جلد نہ بناؤ۔ اس کا ضائع ہوجانا ہی بہتر ہے۔ علم اور ادب کے معاملہ میں ان کے رائے دینے کا انداز یہی ہوتا ہے۔ نتیجہ میں جلد ساز کا کاروبار تو ٹھپ ہوگیا ہوگا۔ لیکن فاروقی تو علم کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فاروقی نے کتابیں پڑھ پڑھ کر چودہ سال کی عمر میں ہی اپنی آنکھیں خراب کرلی تھیں۔ چنانچہ آج بھی وہ ایسی عینک لگاتے ہیں جسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے اپنی آنکھوں کی جلد بندی کرا رکھی ہے۔ اس عینک سے لوگ تو انہیں نظر آجاتے ہیں لیکن لوگوں کو ان کی آنکھیں نظر نہیں آتیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی سے ہمارا شخصی ربط ضبط بھی دہلی آنے کے بعد بڑھا۔ اس کو بھی کئی برس بیت گئے۔ کچھ لوگ انہیں مغرور آدمی سمجھتے ہیں۔ ابتداء میں ہم بھی یہی سمجھتے تھے لیکن کئی ملاقاتوں میں احساس ہوا کہ لوگ جسے فاروقی کا غرور سمجھتے ہیں وہ اصل میں ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا اعتماد ہے۔ کسی بھی علمی اور ادبی مسئلہ پر وہ جس طرح دوٹوک رائے دے دیتے ہیں اور جس شدت سے رائے دیتے ہیں اسے لوگ ان کے غرور سے تعبیر کرتے ہیں۔ یوں بھی فاروقی دو ایک ملاقاتوں میں سمجھ میں آجانے والی شخصیت نہیں ہیں۔ ان کی پہلودار شخصیت کی پرتیں کئی ملاقاتوں کے بعد ہی کھلتی ہیں۔ فاروقی اپنی بات چیت میں گالیوں کا بھی بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ ابتدا میں ہمیں بھی اس سے الجھن سی ہوئی لیکن جب اپنی ہی کسی غلطی پر انہوں نے ان گالیوں کا استعمال خود اپنے لیے کیا تو احساس ہوا کہ

www.taemeernews.com

یہ تو گالی دینے کے معاملہ میں نہایت بے لوث آدمی ہیں۔ایک زمانہ تھا جب فاروقی ہمیشہ اپنے منہ میں پائپ دبا کر رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی مغرور نظر آتے تھے لیکن ادھر کئی برسوں سے یہ سلسلہ ترک ہوگیا ہے۔فاروقی کو ہم نے جب بھی دیکھا لکھتے پڑھتے ہی دیکھا۔آدھی رات کو کبھی کبھی ان کے گھر کے سامنے سے گذر ہوا تو دیکھا کہ کئی موٹی کتابیں سامنے رکھی ہیں اور وہ مطالعہ میں غرق ہیں یا کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔علم اور ادب کے لیے ایسی لگن بہت کم لوگوں میں دیکھی۔آج سے لگ بھگ تیس برس پہلے انہوں نے جب ''جدیدیت'' کا پرچم بلند کیا تو ادب میں زوردار بحثوں کا آغاز ہوگیا۔ہمارے دوست وحید اختر نے جدیدیت کو ترقی پسند کی توسیع قرار دیا۔غرض ان بحثوں میں بڑی اُتھل پتھل ہوئی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اطراف نئے لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوگیا۔فاروقی نے اپنی تنقید کے ذریعہ جدیدیت کی بھرپور تشریح کی۔یہ کسی کی سمجھ میں آئی اور کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔انہوں نے فن پارہ کو ہی فن کی جانچ کا پیمانہ بنایا۔غرض یہ ایک طویل بحث ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ تیس برس پہلے جو لوگ جو ان کے مخالف تھے (بشمول ہمارے) آج وہ رفتہ رفتہ ان سے متفق ہوتے نظر آتے ہیں اور کچھ لوگ جو ان کے حامی تھے اب ان سے دور ہوتے نظر آنے لگے ہیں۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فاروقی نے پچھلے تیس برسوں میں جو بھی باتیں کہیں وہ سب مدلل اور معروضی ہیں جس کا احساس اب ان کے مخالفین کو بھی ہونے لگا ہے۔یہ بھی درست ہے کہ فاروقی کی تحریروں کے زیر اثر بعض لوگ گمراہ بھی بہت ہوئے۔یوں بھی کچھ لوگوں میں اپنے بل بوتے پر گمراہ ہونے کی بڑی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔اس کے لئے فاروقی اور ان کی تحریروں کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہوگا۔ فاروقی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اُردو فارسی اور عربی کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور تب کہیں جا کر مغربی علوم اور ادب سے استفادہ کیا۔اسی لیے ان کی تنقید میں ایک گہراؤ اور توازن نظر آتا ہے۔ان کی نظر آج کے پورے ادبی منظرنامہ پر ہے۔ محمد حسن عسکری نے اگر انہیں حالی کے بعد کا اردو کا سب سے بڑا نقاد قرار دیا ہے تو غلط نہیں کیا ہے۔بلاشبہ وہ ایک دیانت دار نقاد ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو مصلحتوں سے دور

www.taemeernews.com

رکھا ہے۔ وہ گروہ بندی کے بھی قائل نہیں ہیں حالانکہ ان کی تحریروں کے زیر اثر ہمارے ادب میں اپنے آپ ہی ایک گروہ تشکیل پا گیا تھا۔ فاروقی شاعر بھی ہیں لیکن ہمیں ان کی نثر ان کے شعر سے اچھی لگتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی حکومت ہند کے محکمۂ ڈاک کے ایک بہت بڑے عہدہ سے اسی سال کے اوائل میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ لوگ ریٹائر ہوکر دُکھی ہوجاتے ہیں لیکن یہ بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں کہ اب وہ لکھنے پڑھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکال پائیں گے۔ فاروقی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کبھی ادب کے لیے اپنے عہدہ کا استحصال نہیں کیا۔ حالیہ عرصہ میں میر کی شاعری کے مفصل مطالعہ اور تجزیہ کے سلسلہ میں انہوں نے چار جلدوں میں "شعرِ شور انگیز" کے نام سے کتاب لکھی ہے جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ (ہمارے ایک دوست کو شکایت تھی کہ اردو میں ہوٹنگ کا کوئی مناسب ترجمہ نہیں ہے۔ فاروقی کی شہرہ آفاق کتاب کی اشاعت کے بعد انہوں نے اس کتاب کے نام میں تھوڑی سی تحریف کرکے ہوٹنگ کا ترجمہ برآمد کرلیا ہے۔ اب مشاعروں میں ہونے والی ہوٹنگ کو وہ "شور شعر انگیز" کہتے ہیں) ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ فاروقی کی ذات کو سمیٹنا آسان کام نہیں ہے۔ ان کے بے مثال کارناموں کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس سرسری سی تحریر کا مقصد کتاب نما کے ایڈیٹر شاہد علی خاں اور اس خصوصی شمارہ کے مرتب احمد محفوظ کو مبارکباد دینا ہے کہ انہوں نے اردو تنقید کی سب سے اہم شخصیت کے بارے میں ضروری مواد کو یکجا کردیا ہے۔ اگرچہ بہت سے گوشے تشنہ ہیں۔ یوں بھی شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت کی اتنی جہتیں ہیں کہ ان پر ہونے والے ہر کام میں تشنگی تو رہے گی ہی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اس ضمن میں ایک شروعات تو ہوئی ہے۔ (۱۹۹۶)

●

پچھلے دنوں اُردو کے منفرد نقاد، شاعر اور ممتاز دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کو پانچ لاکھ روپیوں کی مالیت کے "سرسوتی سمان" سے نوازا گیا ہے۔ یہ انعام ہر سال برلا فاؤنڈیشن کی طرف سے ہندوستان کی چودہ زبانوں کے ادیبوں اور فنکاروں میں سے کسی ایک کو دیا جاتا

www.taemeernews.com

ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب اُردو کے کسی ادیب اور شاعر کو یہ انعام دیا گیا ہے۔ہم نے اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کو مختلف اداروں کی طرف سے دو ڈھائی لاکھ روپیوں تک کے انعامات کو تو وصول کرتے دیکھا ہے لیکن یکمشت پانچ لاکھ روپیوں کی مالیت کا انعام لیتے ہوئے کسی اور اردو ادیب کو نہیں دیکھا۔ ہندوستان ہی نہیں پاکستان میں بھی کسی اردو ادیب کو اتنی بھاری مالیت کا انعام اب تک نہیں ملا ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر اردو کے ادیبوں اور فنکاروں کو بجا طور پر حسب توفیق یا تو ناز کرنا چاہیے یا حسد کی آگ میں جلنا چاہیے۔ ہم نے دونوں صورتوں کی گنجائش اس لیے رکھی ہے کہ آدمی کے دل کا حال بھلا کون جان سکتا ہے۔ البتہ ہم اپنے دل کی بات بتائے دیتے ہیں کہ ہم اپنا شمار اول الذکر زمرے کے لوگوں میں کرنا چاہیں گے کیونکہ شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے دوست ہیں اور ان سے ہمارے بڑے پرانے مراسم ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے ادبی اور تنقیدی معیار کو برقرار رکھا ہے بلکہ انعامات لینے کے معاملہ میں بھی وہ ایک خاص معیار کو برقرار رکھنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں جب بھی کوئی انعام ملا تو بڑا انعام ہی ملا۔ ایرے غیرے چُٹ بھیئے انعامات کو لینے سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں عالم یہ ہے کہ ہمارے بعض ادیب اور نقاد ایک باضابطہ لائحہ عمل تیار کر کے انعامات کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہر سال کے اختتام پر وہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ کونسا خوش قسمت انعام ہے جو انہیں اب تک نہیں مل پایا ہے۔ پھر وہ اسے حاصل کرنے کی جستجو میں جُٹ جاتے ہیں۔ دروغ برگردن راوی کسی نے بتایا کہ اردو کے ایک دانشور ان دنوں کرانہ مرچنٹس اسوسی ایشن کا انعام حاصل کرنے کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے کہا ''کرانہ مرچنٹس اسوسی ایشن کا انعام کوئی ادبی انعام نہیں بلکہ تجارتی انعام ہے۔ یہ انہیں کیسے مل سکتا ہے؟'' اس پر راوی نے کہا ''حضور! ان دنوں ادب کی سرگرمیاں بھی تو تجارتی سرگرمیوں کی طرح ہی چل رہی ہیں۔ ادب اور تجارت میں اتنی مماثلت پیدا ہوگئی ہے کہ ہمیں تو سودا تولتے وقت ڈنڈی مارنے اور کسی کے بارے میں تنقیدی مضمون لکھنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آدمی کرانہ کی دکان کھولے یا ادب کا کاروبار

www.taemeernews.com

کرے دونوں اصل میں ایک ہی طرح کے کام ہیں کیونکہ دونوں پیشوں میں بے ایمانی قدر مشترک کا درجہ اختیار کرگئی ہے۔ آپ کرانہ مرچنٹس اسوسی ایشن کے انعام پر حیرت کا اظہار کررہے ہیں۔ میرا بس چلے تو اخبار بیچنے والوں کی تنظیم "ہاکرس اسوسی ایشن" کا انعام بھی انہیں دلوادوں کیونکہ وہ بھی اپنے طے شدہ ادیبوں اور شاعروں کے حق میں یوں آواز بلند کرتے ہیں جیسے ان کے ادب کے مطالعہ کی سفارش نہ کررہے ہوں بلکہ آج کا اخبار بیچ رہے ہوں۔"

بہر حال ان دنوں ادب اور ہمارے سماج میں انعاموں کی ایک دوڑ چل پڑی ہے۔ کسی زمانہ میں انعاموں کے سلسلہ میں دو ہی فریقوں کی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک فریق انعام دیتا تھا اور دوسرا فریق انعام لیتا تھا۔ لیکن ادھر کچھ عرصہ سے اس کاروبار میں ایک تیسرے فریق کا بھی اضافہ ہوگیا ہے اور وہ ہے "انعام دلانے والا" اور یہ تیسرا فریق اب اتنی اہمیت اختیار کرچکا ہے کہ ابتدائی دونوں فریقوں کی نوعیت اب ذیلی ہوگئی ہے۔ اب کسی ادیب کو انعام ملتا ہے تو ہر کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ اسے یہ انعام کس نے دیا ہے بلکہ یہ پوچھتا ہے کہ اسے یہ انعام کس نے دلوایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی انعام یافتہ ادیب اب انعام یافتہ کم اور سزا یافتہ زیادہ نظر آتے ہیں اور انعام دلانے والے فرد کے آگے یوں محجوب اور شرمسار رہتے ہیں کہ آنکھ ملا کر بات بھی نہیں کرسکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انعام کسی کو ملتا ہے تو اس کے دس حصہ دار اور دعویدار بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ دور کیوں جایئے ایک بار ہمیں پندرہ ہزار روپئے کی مالیت کا انعام ملا تھا تو ایک صاحب نے اشارۃً ہمیں باور کرایا تھا کہ اس رقم میں وہ بھی دس فیصدی کے حقدار ہیں کیونکہ اس انعام کو دلانے میں انہوں نے بھی تھوڑا سا حصہ ادا کیا ہے۔ یادش بخیر! مشفق خواجہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ......"پروین شاکر مرحومہ کو جب ان کے ایک مجموعے پر اکادمی ادبیات پاکستان کا چالیس ہزار کا انعام ملا تو ساقی فاروقی نے کہا" اس رقم میں سے دس فی صد کا میں حق دار ہوں کیونکہ انعام یافتہ مجموعے کا فلیپ میں نے لکھا ہے۔" یہ بات نظیر صدیقی تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا" ساقی فاروقی کا حصہ ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے وہ مجھے ملنی چاہئے کیونکہ پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت میرے مقالے کی وجہ سے ہے۔" انعاموں کا ذکر چل پڑا ہے تو ہمیں

www.taemeernews.com

ساہتیہ اکیڈیمی کے تیرہ چودہ برس پرانے ایک انعام کی یاد بھی آ گئی جو سندھی زبان کے ایک شاعر کو دیا گیا تھا۔ یہ شاعر ہمارے بھی دوست تھے۔ اردو کے بڑے دلدادہ اور پرستار تھے۔ سندھی میں لکھتے تھے لیکن اُردو کی کتابیں ہمیشہ ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ چونکہ ہمارے پڑوسی تھے اسی لیے ہم سے اکثر ملا کرتے تھے اور اُردو کی کتابیں لے جایا کرتے تھے۔ جب انہیں انعام ملا تو ہمیں بھی خوشی ہوئی کہ چلو ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام کم از کم ہمارے پڑوس تک تو چلا آیا ہے۔ چونکہ ہم سندھی زبان نہیں جانتے اسی لئے ہمیں پتہ نہیں چلا کہ انہوں نے اپنی انعام یافتہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ کچھ عرصہ بعد سندھی زبان کے ایک ادیب کا مراسلہ ایک انگریزی اخبار میں شائع ہوا جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ اس کتاب میں جتنی بھی نظمیں ہیں وہ سب کی سب اُردو شاعروں کی ہیں جن کا راست ترجمہ سندھی زبان میں کر دیا گیا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ جن اُردو شاعروں کی نظمیں اس کتاب میں شامل تھیں وہ سب کے سب ہمارے دوست بھی تھے جیسے کمار پاشی، مخمور سعیدی، شہریار اور قاضی سلیم وغیرہ۔ اور جب ہمارے اُردو شاعر دوستوں کو پتہ چلا کہ سندھی زبان کے انعام یافتہ شاعر ہمارے دوست بھی ہیں تو آنجہانی کمار پاشی مُصر ہو گئے کہ ہم بیچ میں پڑ کر اکیڈیمی کے انعام کی رقم کو اُردو شاعروں میں ان کی نظموں کے تناسب سے تقسیم کریں۔ نتیجہ میں اس انعام کی ایماندارانہ اور منصفانہ تقسیم کے دوران ہماری حالت کہانی والے اس بندر کی سی ہو گئی جس نے دو لڑنے والی بلیوں کے درمیان روٹی کی مساویانہ تقسیم کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ہماری کتنی ہی شامیں اس انعام کی 'بندربانٹ' کی نذر ہو گئیں۔ اس بہانہ جب سارا انعام ہم خود ہڑپ کر چکے تو ہم نے اپنے شاعر دوستوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ "بھیا! ذرا غور سے دیکھو تو تمہارے لیے یہ اطمینان کیا کچھ کم ہے کہ تمہیں بھی بالواسطہ طور پر ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ مل چکا ہے، یہ اور بات ہے کہ تمہیں اُردو میں نہیں بلکہ سندھی زبان میں انعام ملا ہے۔ زبان تو صرف ایک ذریعہ اظہار ہے۔ اصل اہمیت تو شاعری اور انعام کی ہے اور یہ دونوں چیزیں تمہیں مل چکی ہیں۔" ساہتیہ اکیڈیمی کا یہ غالباً واحد انعام تھا جس کی تقسیم ہمارے مبارک ہاتھوں سے لگاتار ڈیڑھ دو برس تک عمل میں آتی

www.taemeernews.com

رہی۔ایک دن ہمارے سندھی شاعر دوست نے جب ہمیں گڑ گڑا کر بتایا کہ وہ اس انعام سے ملنے والی رقم سے کہیں چار گنا زیادہ رقم ہم پر اور اُردو شاعروں پر خرچ کر چکے ہیں تو ہم نے انسان دوستی کے نام پر اور پڑوسی کے حق کو مدنظر رکھتے ہوئے انعام کی تقسیم کے عمل جاریہ کو روک دیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو انعام ملنے کی اطلاع پا کر ہمیں کئی انعامات کی یاد اس لیے آ گئی کہ فاروقی کو ملنے والا غالباً یہ واحد انعام ہے جس میں انعام دینے والا اور انعام لینے والا تو دکھائی دے رہا ہے لیکن انعام دلانے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔نقلی انعاموں کی اس بھیڑ میں یہ ایک خالص اور جینوین انعام ہے اور انعام کی رقم بھی تو ملاحظہ فرمائیے کہ کتنی جینوین ہے۔یہ ایک بلاشرکت غیرے اپنے بل بوتے پر حاصل کیا گیا انعام ہے۔واضح رہے کہ فاروقی کو یہ ایوارڈ ان کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل معرکتہ الآرا تصنیف 'شعرِ شور انگیز'' پر ملا ہے۔اس تصنیف کے بارے میں ہم پہلے بھی اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کر چکے ہیں۔یہ تصنیف اصل میں میر تقی میر کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے کی ایک بے مثال کوشش ہونے کے علاوہ ''میر فہمی'' اور ''میر شناسی'' کے سلسلہ میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ فاروقی کو ملنے والے اس ایوارڈ میں بظاہر ہمیں تو صرف دو ہی حصہ دار نظر آتے ہیں۔ایک تو ہمارے خدائے سخن میر تقی میر ہیں جن کی شاعری پر سے دو صدیاں بیت چکی ہیں۔دوسرا حصہ دار وہ جلد ساز ہو سکتا ہے جس سے فاروقی نے اپنے بچپن میں دوستی کر رکھی تھی اور یہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ جب بھی اس کے پاس کسی کتاب کی جلد بینے کے لئے آئے گی تو وہ پہلے اس کتاب کو انہیں پڑھنے کے لیے دے گا۔شمس الرحمٰن فاروقی کے پاس آج جو علم ہے اس کی بنیاد اسی جلد ساز کی کتابوں پر رکھی گئی ہے۔فاروقی جیسے بے نیاز آدمی کو یہ جو پانچ لاکھ روپیوں کا ایوارڈ ملا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ ان پانچ لاکھ روپیوں کا کیا کریں گے۔وہ چاہیں تو اس جلد ساز کے بارے میں ہمدردانہ غور کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بھی میر تقی میر کی طرح دوسری دنیا میں نہ چلا گیا ہو۔بہر حال یہ ان کا اور جلد ساز کا معاملہ ہے ہم بیچ میں پڑنا نہیں چاہتے۔اگر کوئی ہمیں ایسا ایوارڈ دیدے تو ہم کل ہی سے کیا بلکہ آج ہی سے لکھنا

www.taemeernews.com

بند کر دیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو یہ جو ایوارڈ ملا ہے تو یہ اردو زبان و ادب کے لئے بھی ایک بڑے اعزاز کی بات ہے۔ فاروقی نے آج سے چالیس برس پہلے جدیدیت کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا اور آج وہ ہماری کلاسیکی شاعری کے سب سے بڑے پارکھ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جو شاعر اور ادیب فاروقی کے زیر اثر کلاسیکی ادب کو پڑھے اور سمجھے بغیر ادب تخلیق کر رہے ہیں وہ اس نکتہ پر بھی غور کریں تو نہ صرف ان کا بلکہ بہتوں کا بھلا ہوگا۔

ہم اپنے دوست شمس الرحمٰن فاروقی کو اس ایوارڈ کے ملنے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(۱۹۹۷)

www.taemeernews.com

پروفیسر نثار احمد فاروقی

ماہنامہ ''کتاب نما'' کے مدیر اور مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ اِدھر انہوں نے بعض اہم ادیبوں اور شخصیتوں کے بارے میں اپنے رسالے کے خصوصی شمارے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ انہوں نے ابتداء میں تو دو چار خصوصی شمارے مرحومین کے بارے میں شائع کئے، مگر اب یہ ان لوگوں کے خصوصی شمارے بھی شائع کرنے لگے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اب تک زندہ ہیں (خصوصی شمارے کی اشاعت کے بعد مر جائیں تو یہ الگ بات ہے) مگر یہ اردو والوں کے مزاج کے یکسر خلاف بات ہے۔ ہم کسی کی پیٹھ پیچھے تعریف اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ اس شخصیت کی پیٹھ قبر میں نہ اتار دی جائے جس کی تعریف مقصود ہو۔ زندگی میں تو پیٹھ پیچھے غیبت ہی بھلی لگتی ہے۔ دو ایک بار شاہد علی خاں سے شکایت کی کہ آپ کی اس ''غیر اردو'' حرکت کی وجہ سے ہمیں زندہ ادیبوں کی بھی عزت کرنے کی عادت پڑتی جارہی ہے۔ آخر کتنوں کی عزت کریں؟ مردوں کی تو خیر واجب ہے، اب زندوں کی بھی کرنا پڑ رہی ہے۔ ہماری شکایت کے جواب میں وہ ہمیشہ دور درشن والی ہنسی ہنس کر خاموش ہوجاتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں انہوں نے ہمارے دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی کے بارے میں اپنے رسالے کا ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے (سچ تو یہ ہے کہ اس شمارے کے گہرے مطالعہ کے بعد ہم میں نہ یہ تاب ہے نہ مجال کہ نثار احمد فاروقی کو اپنا دوست کہہ سکیں۔ ہماری کیا بساط کہ اپنے آپ کو ان کے حلقہ احباب میں شامل کرسکیں، حالانکہ ان سے پینتیس (۳۵) برس پرانی دوستی ہے) اگرچہ نثار احمد فاروقی کو ہم بہت پہلے سے ایک بے پناہ عالمِ بے بدل، محقق، بے مثال انشا پرداز اور ایک بے ریا نقاد کے طور پر جانتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ اتنے بڑے عالم، اتنے بڑے محقق اور نقاد وغیرہ ہیں۔ بلاشبہ ہم ان سے

www.taemeernews.com

قدم بہ قدم اکتساب علم کرتے رہے ہیں، لیکن ان سے اتنا ہی ضروری علم حاصل کیا جتنی کہ ہماری خوش دلی اور خوش ذوقی کو ضرورت تھی۔ اب جو خصوصی شمارے میں ان کی علمی فتوحات اور ادبی کارناموں کا تفصیل سے ذکر پڑھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں (نیند میں بھی بڑی مشکل سے بند ہورہی ہیں) ہماری حالت اس غیر تعلیم یافتہ عمر رسیدہ شخص کی سی ہوگئی ہے جس نے پچاس برس کی عمر کے بعد تعلیم حاصل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک دن اس نے گرامر کی کتاب پڑھی اور جب اسے اچانک یہ احساس ہوا کہ گرامر کے باضابطہ مطالعہ کے بغیر بھی وہ پچھلے کم و بیش پچاس برسوں سے صحیح زبان بولتا رہا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ چنانچہ اب ہم اس احساس کے باعث خوشی کے مارے پھولے نہیں سمارہے ہیں کہ پچھلے (۳۵) برسوں سے ہم ایک بڑے عالم کی صحبت میں وقت گزار رہے ہیں اور ہمیں اس کا پتا ہی نہ چل پایا۔ بات دراصل یہ ہے کہ نثار احمد فاروقی علم کا ایک سمندر ہیں۔ جس کو جتنا پانی چاہیے وہ لے لے۔ ہمارے لیے تو چلّو بھر پانی بھی کافی ہے۔ ان کے اس وافر اور فالتو علم سے ہمیں کیا لینا دینا ہے۔ ہم نے ان کے علم سے صرف اتنا ہی استفادہ کیا ہے جتنا کہ ہماری خوش دلی اور خوش ذوقی کو درکار تھا۔ وہ عالم ہونے کے باوجود بے حد ہنسوڑ اور خوش مذاق آدمی ہیں۔ ایسے کھلے دل سے ہنستے ہیں کہ ان کے کھلے دماغ والے عالم ہونے پر شبہ سا ہونے لگتا ہے۔

لندن میں ہیروڈس کا ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے جس میں سوئی سے لے کر ہاتھی تک ساری چیزیں دستیاب ہوجاتی ہیں۔ اصل میں نثار احمد فاروقی بھی علم کا ایک ایسا ہی ڈپارٹمنٹل اسٹور ہیں۔ ہمیں اس ڈپارٹمنٹل اسٹور سے صرف سوئی درکار تھی سو وہ لے لی۔ ہاتھی سے ہمیں کیا مطلب؟ وہ ہم سے عمر میں دو ایک برس بڑے ہوں گے لیکن جتنا علم انہوں نے اس مختصر سی مدت میں اپنی ذات میں جمع کرلیا ہے اس کے لئے ہم جیسے آدمی کو کم از کم پانچ سو برس کی عمر درکار ہوگی۔ جس آدمی نے بارہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا ہو اور جو دنیا کی بہترین کتابوں کا مطالعہ کرچکا ہو، اس کے علم کے کیا کہنے۔ وہ چار زبانوں پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ فارسی تو ان کے گھر کی لونڈی ہے، اردو مادری زبان ہے، عربی

www.taemeernews.com

کے وہ پروفیسر اور استاد ہونے کے علاوہ صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی بھی ہیں۔ انگریزی پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ لگتا ہے کہ انگریز ان کی انگریزی دانی سے مرعوب ہو کر ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ زبانیں تو وہ اور بھی کئی جانتے ہیں لیکن صرف چار زبانوں کو ہی اچھی طرح جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں (ذرا سوچئے کہ شرعی پابندیوں کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے ہیں) لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ اتنی ساری زبانیں جاننے کے باوجود نہایت سادہ اور آسان زبان لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں جو آدمی زبان پر قدرت رکھتا ہے وہ مشکل زبان لکھ ہی نہیں سکتا۔

یاد ش بخیر! ہم سے ان کی ملاقات غالباً ۱۹۵۸ء میں حیدرآباد میں روز نامہ ''سیاست'' کے انتخاب پریس میں ہوئی تھی۔ اردو کے خاموش خدمت گزار منظور احمد (جو ان دنوں اردو مجلس کے سکریٹری تھے) ان کے ہمراہ تھے، کسی مخطوطے کی اشاعت کا مسئلہ تھا۔ پہلی ملاقات میں ہم نثار احمد فاروقی کی گہری علمیت سے مرعوب تو ہوئے تھے لیکن ان کی شخصیت میں خوش دلی کا جوہر ہمیں نظر آیا تو اُسے تھام لیا اور آج تک اسے تھامے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد سے انھیں بے پناہ اُنس ہے۔ بچپن میں وہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے عرصہ میں حیدرآباد کے مدرسہ وسطانیہ اردو شریف میں تعلیم بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اب بھی اکثر حیدرآباد آتے جاتے رہتے ہیں (بڑی خاموشی کے ساتھ)۔

حیدرآباد سے وہ کتنا گہرا تعلق رکھتے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ایک بار انہوں نے ہم سے چکنی سپاری اور لیمو کا حیدرآبادی اچار لانے کی فرمائش کی، وہ ہم نے لاکر ان کے حوالے کیں تو اس کی قیمت دینے لگے، ہم نے لینے سے انکار کیا تو بولے ''ایسا ہے تو اگلی بار ایک کلو سپاری اور دو کلو اچار اور لیتے آیئے گا!''

نثار احمد فاروقی نہایت کم عمری میں ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام، مولانا سید ابو الحسن ندوی جیسے صاحبان علم سے اپنی علمیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اب جو ہم ان کی علمیت کے معاملے میں رطب اللسان ہیں تو یہ بے وقت کی راگنی ہی ہے۔ وہ تو آئے دن علم کے سمندر میں غوطے لگاتے رہتے ہیں اور جب بھی سطح پر نمودار ہوتے ہیں تو تہہ سے کوئی نہ کوئی موتی ضرور لے آتے ہیں۔ ایک بار

www.taemeernews.com

ہمیں بھی علم کے سمندر میں غوطہ لگانے کا مشورہ دے چکے ہیں۔ہم نے کہا: ''ہمیں ڈر ہے کہ ایک بار غوطہ لگایا تو پھر واپس نہیں آنے کے''۔بولے ''فکر نہ کرو، کیا عجب کہ کئی برس بعد کوئی محقق تمھیں موتی کے روپ میں سمندر سے پھر باہر نکال کر لے آئے۔''

نثار احمد فاروقی کی دوستی ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں لائبریری اسٹنٹ کی حیثیت سے اپنی علمی اور عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور آج وہ دہلی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔آج دنیائے علم و ادب میں ان کا طوطی بولتا ہے۔اردو کے اکثر نام نہاد نقاد جو مغربی تنقید کے حوالے دے کر ادب میں اپنی جگہ بنانے کی خواہش میں خوار ہو رہے ہیں، انہوں نے بھی نثار احمد فاروقی سے بہت کچھ اکتساب کیا ہے، یہ سب جانتے ہیں۔

ان کا حافظہ غضب کا ہے۔بلا شبہ اردو، فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار انھیں زبانی یاد ہیں۔ پہلے وہ غالب کے طرفدار تھے، پھر میر کے سخن فہم ہوئے۔میر پر ان کی کتاب ''تلاش میر'' اہل نظر سے داد حاصل کر چکی ہے۔میر کی آپ بیتی ''ذکر میر'' کا سلیس اردو ترجمہ بھی انھوں نے ۱۹۵۷ء میں چھاپا تھا، جس کا دوسرا ایڈیشن آج کل زیر طباعت ہے۔میر کے اشعار بھی وہ ایسے برمحل اور پر تاثیر انداز میں پڑھتے ہیں کہ خود میر بھی اپنا شعر سنتے رہ جائیں۔

ہمیں یاد ہے کہ جب شاہد علی خاں نے ہمیں کتاب نما کا عابد علی خاں مرحوم سے متعلق خصوصی شمارہ مرتب کرنے کے لیے کہا تو ہم بنائے دوستی ہم نے نثار احمد فاروقی سے اس خصوصی شمارے کے لئے مضمون لکھنے کی خواہش کی۔بولے ''کل دوپہر میں گھر آ کر مضمون لے جاؤ۔'' دوسرے دن ہم گئے تو مضمون تیار تھا۔اب جو ہم نے مضمون کو پڑھنا شروع کیا تو دنگ رہ گئے۔ ان کی اپنی مخصوص فصاحت، روانی اور سلاست تو تھی ہی، تا ہم عابد علی خاں مرحوم کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ہم نے کہا ''اتنے کم وقت میں عابد علی خاں مرحوم کے بارے میں اتنی تفصیلات آپ کو کہاں سے مل گئیں؟''

www.taemeernews.com

بولے "میاں مجتبیٰ۔ عابد علی خاں ان بزرگوں میں سے تھے جن کی کتاب زندگی کے ایک ایک ورق کو زبانی یاد رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ جس شخص نے بڑے وقت میں اردو صحافت پر احسان کیا ہو اسے کوئی بھلا دے تو اس سے بڑی محسن کشی اور کیا ہوگی؟"

نثار احمد فاروقی خود ہماری مزاح نگاری کے بارے میں بڑی انوکھی اور دلچسپ رائے رکھتے ہیں۔ اک دن کہنے لگے "تمہارے اکثر مزاحیہ مضامین پڑھتا ہوں تو آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ چنانچہ مضمون "اردو کا آخری قاری" جب بھی پڑھتا ہوں آنکھ سے آنسو پونچھتا ہی رہ جاتا ہوں۔ تمہارے مزاح میں جو غم انگیزی ہے وہ غیر معمولی چیز ہے اور میں اسے مزاح کی معراج سمجھتا ہوں۔"

ہم نے کہا "یہ بات آپ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے غم سے واقف نہیں ہیں، وہ نہایت مضحکہ خیز ہے"۔

بولے "آج کے دور کی سچائی غم کی مضحکہ خیزی اور مزاح کی غم انگیزی کے بیچ میں کہیں پوشیدہ ہے"

نثار احمد فاروقی کی اس بلیغ رائے کے بعد ہی ہمیں پتہ چلا کہ ہماری تحریروں پر لوگ پھوٹ پھوٹ کر کیوں ہنستے ہیں، بلک بلک کر کیوں مسکراتے ہیں، سسک سسک کر کیوں خندہ زن ہوتے ہیں اور دھاڑیں مار مار کر کیوں قہقہے لگاتے ہیں۔

جی تو بہت چاہتا ہے کہ شاہد علی خاں کو اس خصوصی شمارے کی اشاعت پر مبارکباد دی جائے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس خصوصی شمارے کے مطالعہ کا ہماری ذات پر کیا معکوس اثر پڑا ہے کیونکہ ہمیشہ اندیشہ ہے کہ نثار احمد فاروقی سے ہمارے (۳۵) برس پرانے، اور وہ بھی بے تکلفانہ تعلقات، اب ویسے نہیں رہیں گے جیسے کہ اب تک تھے۔ اب ہمیں بھی احتراماً ان کی صحبت میں دیگر عالموں کی طرح خاموش رہنا پڑے گا۔ نقصان ہمارا تو کیا ہوگا۔ ان کا ہی ہوگا، کیونکہ بقول حضرت علیؓ علم تو جاہلوں کو دیکھ کر ہی سیکھا جاتا ہے! (1995)

پروفیسر نثار احمد فاروقی کو اتر پردیش اُردو اکیڈیمی کے ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے

www.taemeernews.com

کی مالیت کے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کے ملنے کی اُڑتی اُڑتی اطلاع ہمیں مدینہ کے اوبرائے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اُس وقت ملی جب ہم ہوٹل کے مینو کارڈ کے تفصیلی مطالعہ کے ذریعے کسی ایسے کھانے کی تلاش میں تھے جو سیدھا سادہ اور زود ہضم ہو۔ ایسا کھانا چونکہ ہمیں مل نہیں پا رہا تھا تو ڈائننگ ہال کے انچارج عباسی صاحب ہمارے پاس آئے۔ عباسی صاحب امروہہ کے رہنے والے ہیں اور اُن میں جتنا ''اپنا پن'' ہمیں نظر آیا اُتنا ''امروہہ پن'' نظر نہیں آیا۔ پہلے ہی دن سے وہ ہم پر اس لیے بھی مہربان ہو گئے تھے کہ ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی کے دوست ہیں۔ کہنے لگے ''کیا میں کھانے کے انتخاب میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ چونکہ نثار احمد فاروقی کے دوست ہیں اس لیے مرغّن غذاوں کی تلاش میں ہوں گے۔''

ہم نے پوچھا ''آپ کو کیسے پتہ کہ فاروقی صاحب مرغّن غذائیں کھاتے ہیں؟''

بولے ''اس لیے کہ میں اُن کا پڑوسی رہ چکا ہوں''

ہم نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ فاروقی صاحب کے گھر کی دعوتوں میں ضرور شریک ہوتے ہوں گے''

بولے ''دعوت میں تو خیر شریک نہیں ہوا البتہ اُن کے گھر سے پکوان کی جو خوشبو آتی ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یوں بھی ایک اچھا اور سچا پڑوسی دوسرے پڑوسی کے حالات کا اسی طرح اندازہ لگاتا ہے۔''

ہم نے کہا ''خدا ہر ایک کو آپ جیسا شائستہ اور مہذب پڑوسی عطا کرے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں مرغّن غذاوں سے پرہیز کرتا ہوں۔ چونکہ ہلکی پھلکی تحریریں لکھتا ہوں اسی لیے غذائیں بھی ہلکی پھلکی لیتا ہوں، فاروقی صاحب کی بات دوسری ہے۔ اُن کی تحقیق اور تنقید اتنی ثقیل اور مرغّن ہوتی ہے کہ اسی مناسبت سے اُن کے لیے مرغّن غذاوں کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے''

ہماری بات پر مُسکرا کر بولے ''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے کل رات ہی پتہ چلا ہے کہ ہندوستان میں فاروقی صاحب کو کچھ ملا ہے۔''

www.taemeernews.com

ہم نے کہا "ضرور کوئی مخطوطہ ملا ہوگا۔ انھیں اس کے سوائے اور مل بھی کیا سکتا ہے۔"

بولے "مخطوطہ نہیں کچھ اور ملا ہے۔"

ہم نے کہا "انھیں کوئی انعام تو نہیں مل سکتا کیونکہ ان دنوں جس طرح کے انعامات رائج ہیں انھیں کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اس گُر سے وہ بالکل ناواقف ہیں۔ یوں بھی وہ انعام کی تلاش میں کم اور مخطوطہ کی تلاش میں زیادہ رہتے ہیں۔ ایک بار انھیں پینتیس برس پرانا ایک مخطوطہ ملا تھا جس پر وہ بے حد خوش تھے، کہنے لگے "اس مخطوطہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسے خیالات پیش کیے گئے ہیں جو میرے اپنے لگتے ہیں۔ مجھے بہت کم مخطوطے ایسے ملے ہیں جن سے میں خود بھی متفق نظر آؤں" ہم نے اس نادر مخطوطہ کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ اس مخطوطہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن سے کم از کم ہمارا بھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے یقین سا ہو گیا کہ یہ مخطوطہ خود نثار احمد فاروقی کا لکھا ہوا ہے جس پر اُنھوں نے مخطوطہ کے لکھے جانے کی تاریخ تو لکھ دی تھی لیکن اپنا نام لکھنا بھول گئے تھے۔ بعد میں جب ہم نے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ امتدادِ زمانہ کے باعث اُن کے سابقہ ہینڈ رائٹنگ اور مروجہ ہینڈ رائٹنگ میں فرق پیدا ہو گیا ہے تو اس مخطوطہ کی دریافت کا سہرا بھی ہمارے سر باندھنے پر مُصر نظر آئے۔ بڑی مشکل ہے ہم اپنے سر کو اُن کے سہرے سے بچا کر بھاگ آئے۔

اس پر عباسی صاحب نے بتایا "آپ اطمینان رکھیں فاروقی صاحب کو اس بار کوئی مخطوطہ نہیں ملا ہے بلکہ انعام ہی ملا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ انعام کی رقم بھی اچھی خاصی ہے۔"

ہم نے کہا "ہوگا کوئی پندرہ بیس ہزار روپے کا انعام"

بولے "جہاں تک مجھے یاد ہے کل رات تک تو اس انعام کی رقم ایک لاکھ روپئے سے اوپر تھی۔ اب کم ہوگئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یوں بھی ہندوستان کے حالات آج کل کچھ ایسے ویسے ہی ہیں۔"

اس اطلاع کو سُن کر ہم اتنے خوش ہوئے کہ عباسی صاحب نے اُس دن جتنی

www.taemeernews.com

مرغن غذائیں کھلائیں سب کی سب کھا گئے۔ آدمی خوش ہوتو اسی طرح کھانا کھاتا ہے۔ اُس دن یقین آیا کہ کبھی کبھی ہماری اُردو اکیڈمیاں غلطی سے صحیح فیصلے بھی کر لیتی ہیں۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کسی اُردو اکیڈیمی کی طرف سے کسی ادیب کو انعام ملتا ہے تو وہ انعام یافتہ کم اور سزا یافتہ زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ جی تو چاہ رہا ہے کہ خود اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی کو اس بات پر کوئی موزوں ایوارڈ دیا جائے کہ اُس نے نثار احمد فاروقی کو اپنا سب سے بڑا ایوارڈ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی کے اعزاز میں ضرور اضافہ ہوگا۔

ایک سال پہلے جب مکتبہ جامعہ نے نثار احمد فاروقی کے بارے میں ''کتاب نما'' کا خصوصی شمارہ شائع کیا تھا تو ہم نے ایک تاثراتی مضمون لکھا تھا۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ ہمارے لکھنے کے باوجود اس خصوصی شمارہ کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکا ہے۔ اب دوسرا ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ خدارا یہ نہ سمجھئے کہ اس خصوصی شمارہ کے سارے نسخے خود نثار احمد فاروقی نے خریدے ہیں۔ جیسا کہ خصوصی شماروں کے سلسلہ میں عموماً ہوتا آیا ہے۔ ہمارے استفسار پر بتایا کہ اس خصوصی شمارہ کے صرف چھ نسخے اُنھوں نے خریدے تھے۔ باقی کے سارے نسخے اہل علم وادب نے قیمت دے کر خریدے ہیں۔

ان کے خصوصی شمارہ کا پہلا ایڈیشن جس تیز رفتاری سے فروخت ہوا ہے اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ ہم حیدرآباد کے ایک پرنٹنگ پریس کے مینیجر ہوا کرتے تھے۔ اُردو کے ایک شاعر نے (جو اُن دنوں نوجوان تھے اور خدا کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ درازی عمر کے باعث پھر سے بچہ بن گئے ہیں) ہمارے پریس میں اپنا پہلا مجموعہ کلام طبع کروایا تھا۔ اگر چہ اس مجموعہ کلام کے کل پندرہ سو نسخے چھپے تھے لیکن ابتدائی چار صفحات کی طباعت کے معاملہ میں اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ اُنھیں دو مرتبہ چھاپا گیا تھا۔ ابتدائی ایک ہزار کاپیوں میں پہلے ایڈیشن کی تعداد اشاعت ایک ہزار دکھائی گئی تھی اور دوسرے ایڈیشن کے فرمے میں جو ساتھ ہی چھپا تھا یہ

بتایا گیا تھا کہ دوسرے ایڈیشن کی تعداد اشاعت پانچ سو نسخے ہے۔ اگر چہ ہم اندر کا حال اچھی طرح جانتے تھے لیکن شاعر موصوف نے اپنی مقبولیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے پندرہ دنوں کی اندر ہی یہ اعلان کر دیا کہ اس مجموعہ کلام کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں بھی رسم اجرا کے موقع پر دو جملے بولنے کے لیے کہا گیا اور ہم نے اس جلسہ میں سچ مچ دو جملے ہی بولے اور ایسے جملے بولے کہ شاعر موصوف سے اب تک ہمارے تعلقات بحال نہ ہو سکے۔ ہم نے کہا تھا ''حضرات! اس مجموعہ کلام کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی مسرت میں ایک خصوصی رعایت کا اعلان بھی کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ خریدیں گے انھیں پہلے ایڈیشن کے دو نسخے مفت میں دیئے جائیں گے۔''

(جولائی 1996)

www.taemeernews.com
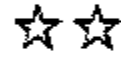
وحید اختر

بہت پُرانے رشتے جب ٹوٹنے اور بکھرنے لگتے ہیں تو دنیا خود بخود چھوٹی نظر آنے لگتی ہے۔ اگرچہ دنیا نہ تو چھوٹی ہوجاتی ہے اور نہ ہی بڑی مگر رشتوں کے سمٹ جانے پر کسی فرد کا داخلی اور انفرادی احساس کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب وحید اختر بھی پچھلے ہفتہ داغ مفارقت دے گئے تو یوں لگ رہا ہے جیسے وہ اپنے ساتھ وہ رفاقتیں اور رقابتیں بھی لے گئے جن کا آغاز 1953 میں عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں ہوا تھا۔ 43 برس کا عرصہ بہت ہوتا ہے لیکن وحید اختر جیسے شخص کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے یہ عرصہ پھر بھی کم ہی سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس وقت کے حیدرآباد میں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں لیکن پھر بھی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو شعر و ادب کا غلغلہ اور بول بالا تھا۔ کتنے ہی نوجوان شاعر اور ادیب تھے جو ان دنوں اُردو میں لکھ رہے تھے۔ وحید اختر کالج میں ہم سے تین برس سینئر تھے اور جب ہم بی۔اے کرنے کے لئے گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے تو انھیں اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے ہوئے دو تین برس بیت چکے تھے۔ ان کا شمار سینئر طلباء میں ہوتا تھا اور بحیثیت شاعر بھی حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں وہ خاصے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ہم جیسے جونیر طلباء کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یوں بھی وحید اختر کی انا کچھ اتنی بلند تھی (جو آخر وقت تک بلند ہی رہی) کہ وہ ایروں غیروں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ پھر ہم تو ان کے جونیر ٹھہرے۔ اُن دنوں آرٹس کالج کی ''بزم اُردو'' کے انتخابات بڑی دھوم دھام کے ساتھ لڑے جاتے تھے۔ خاصی گرما گرمی رہتی تھی۔ 1954ء کے انتخابات میں امیدواروں کے دو پینل (panel) تھے۔ وحید اختر ایک پینل میں صدارت کے امیدوار تھے اور ہم اُن کے مخالف پینل میں جنرل سکریٹری کے عہدہ کے امیدوار تھے۔ انتخابات کے نتائج آئے تو وحید اختر اور ان کے ساتھی بُری طرح ہار گئے۔ وحید اختر کی شہرت کے باوجود انتخابات میں اُن کی شکست کے بارے میں خود وحید اختر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا ''نوعمری میں شہرت

www.taemeernews.com

اور اہمیت حاصل ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اپنے ہم عمروں سے کٹ جاتا ہے۔اپنے ہم درسوں سے اس دوری اور بول چال کی غیر حیدرآبادیت کو جس شخص کی وجہ سے میں نے اپنا زیاں محسوس کیا اور جس شخص کے ہاتھوں مجھے یونیورسٹی کے کسی الیکشن میں پہلی بار شکست ہوئی وہ مجتبیٰ حسین تھا''۔ہم تو اس ہار جیت کو کب کے بھول گئے لیکن وحید اختر ایک لمبے عرصہ تک نہیں بھولے۔ انھیں اسے بھلانے اور ہمارے تعلق سے اپنے دل کو صاف کرنے میں پورے بیس برس لگ گئے۔مگر جب انھوں نے اپنے دل کو صاف کرلیا تو یوں کیا کہ لگتا تھا وہ سب سے زیادہ ہم سے ہی قریب ہیں۔وحید اختر اپنے اطراف نہ جانے کیوں طرح طرح کے حصار باندھنے کے قائل تھے۔اگر چہ ان کے والدین کا تعلق اتر پردیش سے تھا لیکن وحید اختر کی ساری تعلیم وتربیت سابق ریاست حیدرآباد ہی میں ہوئی۔ اس کے باوجود وحید اختر نے کبھی بول چال کے حیدرآبادی لہجہ کو اختیار نہیں کیا۔

جب جب وہ اپنے آپ کو''ہم'' کہتے تھے تو خود کو حیدرآباد سے دور کرلیتے تھے۔وحید اختر میں یہ تضاد ہمیشہ رہا کہ حیدرآباد میں رہے تو اپنی اتر پردیش والی نسبت پر فخر کرتے رہے اور اتر پردیش میں رہنے لگے تو حیدرآباد سے اپنے تعلق کو نمایاں کرنے لگے۔ وحید اختر نے نہایت مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی تھی اور بچپن کے ان نامساعد حالات کی تلخی کا اثر ان کی ذات میں ہمیشہ برقرار رہا۔ہر کسی سے الجھنا اور خاص طور پر بڑوں سے الجھنا اور الجھ کر پھر سے اپنے آپ کو الجھاتے چلے جانا ان کی فطرت تھی۔وہ بڑے ذہین آدمی تھے اور اپنی''روشنی طبع ''کو اپنے لیے بلا بنا لینے کا ہنر انہیں آتا تھا۔ان کا مطالعہ بے حد وسیع اور عمیق تھا اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ہم نے بہت کم شاعروں کو اچھی نثر لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔وحید اختر بے پناہ نثر لکھتے تھے اور بے تکلف لکھتے تھے۔لگ بھگ ایک برس تک انہوں نے روزنامہ''سیاست'' کا طنزیہ کالم''شیشہ وتیشہ''بھی لکھا۔60ء کی دہائی میں رسالہ''صبا''میں ان کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔اس مضمون کے باعث سجاد ظہیر سے ان کا معرکہ ہوا اور ایک لمبے عرصے تک''صبا''میں اس پر بحث چلتی

www.taemeernews.com

رہی۔ یہ ایک رجحان ساز مضمون تھا جس کی اشاعت کے بعد ہی برصغیر کے ناقدوں نے جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں کا نئے پس منظر میں جائزہ لیا۔

وحید اختر کی حس مزاح بہت تیز تھی اور وہ اکثر فقرے کستے رہتے تھے جن میں طنز کی زہرنا کی بھی موجود ہوتی تھی۔ ابھی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے جب وہ علی گڑھ سے آکر دہلی کے گنگارام اسپتال میں شریک ہوئے تھے۔ ہمیں اطلاع کرائی تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ بے حد کمزور نظر آئے۔ انہیں اس وقت Intensive Care Unit میں منتقل کیا جارہا تھا۔ ہم نے ان کے ایک اور قریبی دوست کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا "انہیں آپ کے دہلی آنے کی اطلاع ہے یا نہیں؟" بولے "سارے احباب اپنی بچی کچھی شہرتوں کو سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ ان مردودوں کو کیا اطلاع کرائیں۔" اتنا کہنے کے بعد ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسپتال کا عملہ انہیں یونٹ میں منتقل کرنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ مگر انہوں نے ہماری آمد کے پیش نظر آدھے گھنٹے کی مہلت مانگی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم دوسرے دن حیدرآباد جارہے ہیں۔ کسی سے کچھ کہنا ہو تو بتائیں۔ نہایت اعتماد اور اطمینان سے کہا "اب کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔"

وحید اختر سے یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

وحید اختر نہایت جری اور نڈر انسان تھے۔ دو ڈھائی برس سے وہ گردوں کی خرابی کے مرض میں مبتلا تھے۔ ڈائی لائیسس پر زندہ تھے۔ اس مرض میں آدمی "چابی کا گھوڑا" بن جاتا ہے۔ چابی دیجئے تو چلتا رہے گا اور وہ بھی دن بدن کمزور ہوتا ہوا۔ ایسی خطرناک بیماری کے باوجود وحید اختر کبھی اپنے احباب سے اس بیماری کا ذکر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کی تفصیل میں جاتے تھے۔ جب بھی ملتے ادب، آرٹ اور قریبی احباب کی باتیں کرتے۔ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے تھے کہ وہ ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہیں۔ سانحات اور مصائب کو پورے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کا ان میں زبردست مادّہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً ان کے بچپن کے نامساعد حالات بھی رہے ہوں۔ سات، آٹھ برس پہلے ایران ایرلائنس کے طیارہ کے حادثہ میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی اہلیہ کا پلین رات کو دہلی کے ہوائی

www.taemeernews.com

اڈے پر آنے والا تھا اور وہ انہیں ریسیو کرنے کے لئے علی گڑھ سے سیدھے ایرپورٹ چلے گئے تھے۔طیارہ جب نہیں آیا اور اس کے حادثہ کی مشکوک اطلاع انھیں ملی تو وہ ایرپورٹ سے اپنے بیٹے حسین وحید اور اس کے احباب کے ساتھ صبح کی اولین ساعتوں میں ہمارے گھر پہنچ گئے۔انہیں پورے وثوق کے ساتھ یہ پتہ نہیں تھا کہ جو طیارہ حادثہ کا شکار ہوا ہے اس میں ان کی اہلیہ سفر بھی کر رہی تھیں یا نہیں کیونکہ وہ "ویٹنگ لسٹ" کی مسافر تھیں۔ہم نے انہیں دلاسا دیا کہ ہوسکتا ہے وہ اس طیارہ میں نہ ہوں۔دن نکل آئے تو وزارت خارجہ اور ایران ایرلائینس کے ذرائع سے پتہ کرلیں گے۔وحید اختر نے اس وقت جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لیے حیرت ناک تھا۔ناشتہ کے بعد ہم نے انہیں آرام کرنے کے لئے کہا اور وزارت خارجہ سے تفصیلات حاصل کرنے کے لئے چلے گئے۔ہم جانے لگے تو بولے "آپ کا جانا بیکار ہے۔ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں" پھر اپنی ایک پرانی نظم کا مصرعہ سنایا۔

؎ اس سمندر میں کہاں ڈھونڈنے جائیں تم کو

بولے "پتہ نہیں یہ مصرعہ ہم سے کیوں اور کیسے سرزد ہوگیا تھا"

(ایران ایرلائین کا یہ طیارہ خلیج فارس میں گرا تھا)

یہ کہہ کر وہ بیڈروم میں چلے گئے۔دیر تک مختلف ذرائع سے اس بات کی توثیق ہوگئی کہ بیگم وحید اختر اس طیارہ میں سفر کر رہی تھیں،سوال یہ تھا کہ اس بری خبر کو کس طرح وحید اختر پر ظاہر کیا جائے۔جب جب کمرہ میں جھانک کر دیکھا انہیں آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ہم نے اس عرصہ میں ان کے بعض قریبی احباب کو بلا لیا کہ جب اس سانحہ کی اطلاع انہیں دی جائے تو وہ بھی موجود رہیں۔دوپہر میں وہ کچھ دیر کے لئے کمرہ سے باہر آئے تو ہم نے یہ سوچ کر کہ انہیں سانحہ کو برداشت کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا جائے کہا کہ "ابھی کوئی مصدقہ اطلاع تو نہیں ملی ہے لیکن قیاس ہے کہ بیگم وحید اختر اس طیارہ میں موجود تھیں۔" بڑی بے نیازی کے ساتھ بولے "آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ وہ اس طیارہ میں موجود تھیں اور اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔" پھر وہ کمرہ میں

www.taemeernews.com

چلے گئے۔اسی اثناء میں کچھ احباب بھی آ گئے۔پھر علی گڑھ سے شہر یار کا فون آیا کہ اس خبر کو سن کر ان کے چھوٹے بیٹے محسن کی حالت خراب ہوگئی ہے۔وحید اختر کو فوراً علی گڑھ بھیجیں۔ شام کو ہم نے محسن کے بارے میں بتایا تو آدھی رات کو وہ ٹیکسی سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہوگئے۔وحید اختر اکیلے ہی اکیلے کمرہ بند کر کے اس سانحہ کو برداشت کرتے رہے اور کسی دوست کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ تسلی کے دو لفظ بھی کہہ سکے۔وحید اختر کی آنکھیں سرخ تھیں لیکن انہوں نے کسی کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ سکے۔صبر وتحمل اور برداشت کا یہ مظاہرہ حیرت ناک تھا۔وحید اختر کی سینکڑوں باتیں اب یاد آ رہی ہیں۔علمی اور ادبی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی لیکن ان کے مزاج کی تلخی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے کتراتے تھے۔علی گڑھ میں رہ کر بھی وہ الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔فلسفہ کے لکچرار کی حیثیت سے وحید اختر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔بعد میں وہ صدر شعبہ فلسفہ اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی بن گئے تھے۔ان کی راست گوئی بلکہ تلخ گوئی کی وجہ سے یونیورسٹی کے ارباب بھی پریشان رہتے تھے۔پچھلے مہینہ دہلی کے گنگا رام اسپتال میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔حیدرآباد سے واپس آ کر ہم نے پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ واپس علی گڑھ چلے گئے ہیں۔ایک ہفتہ پہلے شہر یار نے فون پر بتایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور اب وہ کچھ ہی دن کے مہمان رہ گئے ہیں۔پھر دو ایک دن کے اندر ہی یہ اطلاع آ گئی کہ وہ بالآخر چل بسے۔وحید اختر سے بہت سے لوگوں کو "اختلاف" تھا لیکن سب ان کی بے پناہ ذہانت اور علمیت کے بارے میں "متفق" نظر آتے تھے۔وہ اپنی وضع کے اکیلے آدمی تھے۔نہ جانے کیوں ہم سے اتنی محبت کرتے تھے۔علی گڑھ سے آتے ہی ہمیں فون کرتے تھے۔پچھلے سال ہم "رشید احمد صدیقی سیمینار" میں حصہ لینے کے لیے علی گڑھ گئے تو دیکھا کہ وحید اختر سامعین میں موجود ہیں حالانکہ ان کی صحت ان دنوں بہت خراب تھی۔بولے "ہم تو صرف آپ کی وجہ سے یہاں آ گئے ہیں ورنہ ہم علی گڑھ کی کسی ادبی محفل میں نہیں جاتے۔" وحید اختر کے چلے جانے سے اردو ادب کا نقصان تو ہوا ہی ہے ہمارا بھی ایک ایسا شخصی نقصان ہوا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

(دسمبر 1996)

www.taemeernews.com

پروفیسر شکیل الرحمٰن

ٹیلی ویژن پر حالیہ چناؤ کے نتیجوں کا اعلان ہو رہا تھا اور ایک نتیجہ جسے جاننے کے لیے میں بے چین تھا اُس کا دُور دُور تک کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔ تقریباً سارے نتیجوں کا اعلان ہو چکا تھا۔ کیسے کیسے لوگ چناؤ جیت رہے تھے اور دوسری طرف بڑی بڑی توپیں بلکہ بوفورس توپیں گرتی چلی جارہی تھیں۔ مگر میری دلچسپی آخر میں صرف ایک نتیجہ میں اٹک کر رہ گئی تھی اور وہ تھا بہار کے چناؤ حلقہ دربھنگہ کا نتیجہ، جہاں سے پروفیسر شکیل الرحمٰن چناؤ لڑ رہے تھے۔ میں نے تھک ہار کے بہار بھون فون کیا۔ وہاں کے انفارمیشن آفیسر نے فون اٹھایا تو میں نے پوچھا "بھئی! وہ دربھنگہ چناؤ حلقہ کا کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولا "ابھی تک شاید ووٹوں کی گنتی ہو رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "ووٹوں کی گنتی ہو رہی ہے یا نوٹوں کی؟ ووٹوں کی گنتی میں تو اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ نوٹ گننا ہو تو ایک الگ بات ہے۔" انفارمیشن آفیسر نے ہنس کر کہا "بہت بے چین لگتے ہیں آپ اس نتیجہ کے لیے۔ آپ کی دلچسپی کس میں ہے؟"

میں نے کہا "وہ اصل میں پروفیسر شکیل الرحمٰن ہیں نا وہ اس حلقہ سے چناؤ لڑ رہے ہیں" انفارمیشن آفیسر نے کہا۔ "آپ اطمینان رکھیں یہ جیت جائیں گے۔" میں نے حیرت سے کہا "جیت جائیں گے! معاف کیجئے۔ آپ نے غلط سمجھا۔ میں ان کے جیتنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان کا کیا حشر ہوا۔"

انفارمیشن آفیسر نے کہا "ان کا حشر ٹھیک ہی ہوگا جی۔"

میں نے کہا "تو پھر میرا کیا حشر ہوگا؟"

www.taemeernews.com

انفارمیشن آفیسر نے کہا ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔شکیل الرحمٰن میں تو دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان کے جیتنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔''

میں نے کہا ''بات دراصل یہ ہے کہ عام چناؤ کا اعلان ہونے سے بہت پہلے میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ چناؤ میں حصہ نہ لیں۔چنانچہ اس وقت وہ میرے مشورہ کے خلاف چناؤ میں حصہ لے رہے ہیں۔میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے مشورے پر عمل نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

انفارمیشن آفیسر نے فون کا ریسیور رکھتے ہوئے کہا ''آپ کو میرا ایک ناچیز مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو مشورے نہ دیا کریں۔''

اور اس بات چیت کے چند گھنٹوں بعد مجھے پتہ چلا کہ میں دوستوں کو کبھی صحیح مشورے نہیں دیتا کیونکہ میرا مشورہ ناکام ہو چکا تھا اور شکیل الرحمٰن کامیاب ہو گئے تھے۔ میں ایک عجیب وغریب احساس سے گذر رہا تھا۔جہاں پروفیسر شکیل الرحمٰن کے جیتنے کی خوشی تھی وہیں اپنے مشورے کے غلط ثابت ہونے کی ندامت بھی تھی۔

پچھلے برس جب انہیں متھلا یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ سے ہٹایا گیا تھا تو ان کے دوستوں کو بہت دکھ پہنچا تھا۔ان کے بہی خواہوں نے اور خاص طور پر میرے دوست شمس الزماں نے اس وقت کے ارباب حل وعقد سے جا جا کے کہا بھی تھا کہ یہ سب غلط ہورہا ہے۔دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس وقت کے ارباب حل وعقد بھی شخصی طور پر تو کہتے تھے کہ یہ غلط ہوا ہے لیکن اجتماعی طور پر کچھ کرنے کے اہل نہیں تھے۔انفرادی سچ ایک منزل پر پہنچ کر جب اجتماعی جھوٹ میں بدل جاتا ہے تو یہ وقت بہت برا ہوتا ہے۔پروفیسر شکیل الرحمٰن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔سارے سچ بولنے والوں نے بالآخر چپ سادھ لی۔اسی بیچ شکیل الرحمٰن دہلی آئے تو ہمیشہ کی طرح اپنے آنے کی اطلاع مجھے دی۔میں یہ سوچ کر ان کے پاس گیا کہ ان کا غم غلط کرنے کے لئے ہنسی مذاق کی باتیں کرکے آجاؤں گا مگر وہ مجھ سے زیادہ خوش باش اور خوش گفتار نظر آئے۔ہمیشہ گمبھیرتا اور سنجیدگی میں ڈوبی رہنے والی شخصیت اچانک غیر سنجیدہ اور چنچل نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی ذات میں اعتماد اور عقیدہ دونوں ہی

www.taemeernews.com

ایک نئی کروٹ لینے اور ایک نئی جست لگانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے

اگر چہ اس وقت کسی دلاسہ کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے دلاسہ دینے کے انداز میں ان سے کہا۔ "شکیل بھائی! یہ اچھا ہوا کہ آپ کی ذات وائس چانسلری کی تہمت سے پاک ہوگئی۔ ان دنوں کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنے رہنا کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے یوں بھی اب جہالت کو بڑے پیمانے پر عام کرنے کا ذریعہ بنتے جا رہے ہیں اور پھر آپ نے تو بہت ساری وائس چانسلری کر لی۔ اتنی بھی وائس چانسلری اچھی نہیں ہوتی۔ آپ کو یاد ہوگا بارہ تیرہ برس پہلے آپ سے جب پٹنہ کے جشن مزاح میں پہلی ملاقات ہوئی تھی تو آپ تب بھی بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور آپ گنگا کو پار کر کے اس جشنِ مزاح کی صدارت کرنے کے لئے مظفر پور سے پٹنہ آئے تھے۔ آپ نے ایک بار گنگا پار کر لی تھی تو آپ کو پھر گنگا کے اس پار نہیں جانا چاہیے تھا۔ درمیان میں آپ کشمیر یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی رہے اور اب میتھلا یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے تازہ تازہ ہٹے ہیں۔ اتنی وائس چانسلریاں تو ایک آدمی کے پہلے جنت میں جانے اور بعد میں دوزخ میں جانے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔"

شکیل الرحمٰن ہنس کر بولے "وائس چانسلری کی بنیاد پر جنت اور دوزخ میں جانے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے کہا "علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ہاشم علی اختر نے، جو میرے کرم فرما بھی ہیں، ایک لطیفہ سنایا تھا کہ ایک وائس چانسلر مرنے کے بعد دوسری دنیا میں گیا تو اس کے اعمال کی جانچ پڑتال کرنے والے فرشتے نے اس سے پوچھا "نیچے کی دنیا میں آپ کیا کرتے تھے؟"

وائس چانسلر نے کہا "فلاں یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔"

فرشتے نے پوچھا "آپ کتنی مرتبہ یا کتنے Term تک وائس چانسلر رہے۔"

www.taemeernews.com

وائس چانسلر نے کہا ''ایک ٹرم کے لیے وائس چانسلر بنا رہا۔''

فرشتے نے جنت کے داروغہ سے کہا ''اس شخص کو جنت میں جانے دو کیونکہ یہ دوزخ میں رہنے کی سزا اپنی یونیورسٹی میں جیتے جی بھگت چکا ہے۔'' اور یہ وائس چانسلر جنت میں چلا گیا۔

اتفاق سے کچھ دیر بعد ایک اور وائس چانسلر مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا تو اسی فرشتے نے پوچھا۔ ''آپ نیچے کیا کرتے تھے؟''

وائس چانسلر بولا ''فلاں یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا۔''

فرشتہ بولا۔ ''وائس چانسلر بنو گے تو تمہارا مرنا اور پھر یہاں آنا ضروری تھا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کتنے ٹرم کے لیے وائس چانسلر رہے ہو۔'' وائس چانسلر نے فخر سے کہا ''دو ٹرم کے لیے وائس چانسلر رہ چکا ہوں۔'' فرشتے نے دوزخ کے داروغہ سے کہا ''اس شخص کے لیے دوزخ کے دروازے کھول دو کیونکہ اسے دوزخ میں رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایک بار دوزخ میں جانے کے بعد یہ دوسری مرتبہ بھی دوزخ میں چلا گیا تھا۔ اب اسے تیسری اور آخری مرتبہ دوزخ میں جانے دو۔''

شکیل الرحمٰن نے اس لطیفہ پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن یہ قہقہہ ان کے عام قہقہوں سے مختلف تھا۔ اس قہقہے میں مجھے ایک ایسا حوصلہ اور ایسا عزم نظر آیا جیسے وہ پھر دوزخ میں جانے کے لیے آمادہ ہوں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے کہا ''شکیل بھائی! اب کچھ لکھنے پڑھنے۔ اب تو آپ کے دو بچے بھی ماسکو سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آ گئے ہیں اور کیا چاہیے۔''

بولے ''بہت لکھ لیا اور بہت پڑھ لیا۔ اب تک جو کچھ لکھا اور پڑھا ہے اس پر عمل کرنے کا ارادہ ہے۔''

میں نے کہا ''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آج تک کسی نے لکھنے پڑھنے پر عمل کیا ہے۔ ہمارے علم کی خوبی بلکہ عافیت اسی میں ہے کہ اس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ سچا علم وہی ہے جس پر کوئی عمل نہ کر سکے۔ ہم قلم سے تلوار کا کام لینے کی بات تو کرتے ہیں لیکن قلم

www.taemeernews.com

جب تلوار بننے لگتا ہے تو اسے توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ہم اپنے خون دل میں انگلیاں تو ڈبو دیتے ہیں اور حلقہ زنجیر میں اپنی زبان بھی رکھ دیتے ہیں۔پھر اس کے بعد نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔''

شکیل الرحمٰن بڑی گمبھیرتا کے ساتھ بولے''مگر اس بار میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ کچھ کرنا چاہیے۔''

میں نے کہا'' آپ اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔دو ایک مضامین یا کتابیں ہی تو لکھ سکتے ہیں۔''

بولے۔''بھائی! میں عملی سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا''شکیل بھائی! مذاق نہ کیجیے۔آپ اور عملی سیاست! آپ تو ادب کی سیاست تک نہیں چلا پاتے۔ملک کی سیاست میں کس طرح حصہ لیں گے۔''

بولے''وقت آئے گا تو دیکھ لینا۔''

میں نے پوچھا''کیا کریں گے آپ؟''

بولے''چناؤ لڑوں گا۔''

میں نے انہیں اس فیصلہ سے باز رکھنے کی خاطر عملی سیاست میں پیش آنے والی دشواریوں اور ذلتوں کا ذکر کرنا چاہا مگر وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ضمانت کے ضبط ہونے کا خدشہ بھی ظاہر کیا۔یہ بھی کارگر نہ ہوا۔اس کے بعد وہ بہار واپس چلے گئے۔اور ان کے بہار پہنچتے ہی عام چناؤ کا اعلان ہوگیا۔اس اثنا میں مجھے یہ اطلاعیں مل چکی تھیں کہ جن حالات میں پروفیسر شکیل الرحمٰن کو متھلا یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ سے ہٹایا گیا تھا اس پر دربھنگہ کے عوام اور خاص طور پر متھلا یونیورسٹی کے طالب علموں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ شکیل الرحمٰن اس غم و غصہ کو ایک تحریک کی شکل دینے کے اہل بن گئے ہیں۔بہت دنوں تک پتہ ہی نہ چلا کہ آیا واقعی شکیل بھائی عام چناؤ لڑ رہے ہیں۔ایک دن پتہ چلا کہ وہ جنتا دل کے امیدوار کی حیثیت سے بہار کے اسی وزیر تعلیم کے خلاف چناؤ لڑ رہے ہیں، جس نے انہیں وائس چانسلر شپ سے ہٹایا تھا۔شکیل بھائی دُھن کے پکے ہیں

www.taemeernews.com

جسے بعض لوگ ضد سے تعبیر کرتے ہیں۔حالانکہ آدمی کے دُھن کے پکّے ہونے اور اس کے ضدّی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔اگرچہ دل ہی دل میں اس احساس سے خوشی بھی ہوئی کہ بھلے ہی شکیل الرحمٰن اپنے حریف کو شکست نہ دے سکیں تاہم اپنے حریف کے خلاف کچھ کہنے اور اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کا انہیں موقع تو ملے گا۔پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی کہ دل کسی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ شکیل الرحمٰن جیت جائیں گے۔مگر جب نتیجہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ جس آدمی نے فائل پر شکیل الرحمٰن کو وائس چانسلر شپ سے ڈِسمس کیا تھا اسے پروفیسر شکیل الرحمٰن نے وزارت تعلیم کے عہدے سے ڈِسمس کردیا ہے۔فائل کے فیصلے اورعوام کے فیصلے میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ان کی جیت کی اطلاع پا کر احساس ہوا کہ ہماری جمہوریت میں شرفاء کے لیے اب بھی گنجائش باقی ہے۔اگرچہ میرا مشورہ غلط ثابت ہو چکا تھا لیکن شکیل الرحمٰن کی جیت کی جتنی خوشی مجھے ہوئی شاید ہی کسی اور کو ہوئی ہو۔

اردو کے ایک ادیب کی حیثیت سے میں شکیل الرحمٰن کی جیت کو سچے اردو کلچر کی جیت سمجھتا ہوں۔پروفیسر شکیل الرحمٰن سے میرے مراسم تیرہ چودہ برس پرانے ہیں۔پہلی ملاقات ہی سے وہ مجھے بہت عزیز رکھتے آئے ہیں۔لیکن ان سے مزید قربت اس وقت ہوئی جب وہ میرے دفتر کے ایک سمینار میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔وہ سچے اسکالر کی زندگی جیتے ہیں۔ہر دم لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ایک دن کہنے لگے۔"میرے پاس پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں ہیں۔کچھ کتابیں میرے کمرے پر روانہ کردینا۔"میں نے سوچا اپنی کتابیں شکیل بھائی سے پڑھوانے کا یہ بہترین موقع ہے لہٰذا اپنی ساری کتابیں انہیں دیدیں۔جب بھی ان کے پاس جاتا انہیں میری کتابوں کے مطالعہ میں غرق پاتا۔سچ پوچھیے تو میں ان کتابوں کو لکھنے میں اتنا غرق نہیں ہوا تھا جتنا کہ شکیل صاحب کو ان کے مطالعہ میں غرق پایا۔کتابوں کے حاشیوں پر جابجا کچھ لکھتے بھی جاتے تھے۔آٹھ دس دن بعد جب وہ جانے لگے تو میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنی کتابوں کے بارے میں رائے جاننی چاہی۔بڑی بے نیازی سے بولے"اپنی رائے میں ضرور دوں گا لیکن وقت آنے پر۔"پندرہ دن بعد میرے دفتر میں ایک رجسٹرڈ پارسل آیا۔اسے کھولا تو دیکھا کہ پروفیسر

www.taemeernews.com

شکیل الرحمٰن نے میرے بارے میں پوری ایک کتاب ''مجتبیٰ حسین کا فن'' کے نام سے لکھ دی ہے جو بعد میں حیدرآباد سے شائع بھی ہوئی۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ یہ پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی عجیب و غریب شخصیت ہیں۔ اپنے عمل سے کسی بھی طرح اردو کے پروفیسر یا نقد نہیں لگتے۔ بیٹھے بٹھائے میرے بارے میں کتاب لکھ دی۔ نہ مجھ سے منتیں کروائیں، نہ گزارش کرنے کا موقع دیا۔ مجھے یہ بتانے کی بھی مہلت نہ دی کہ بحیثیت ناقد وہ کتنا اونچا مقام رکھتے ہیں۔

میں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن کو اردو کے دیگر پروفیسروں اور ناقدوں سے بالکل مختلف پایا۔ ہمارے بعض پروفیسر گفتار کے غازی تو ہیں لیکن کردار کیا ہوتا ہے اس کے املا تک سے ناواقف ہیں۔ ظرف اور ضمیر کی دولت تو جیسے ان سے چھن سی گئی ہے۔ ادب کی سیاست کو چلاتے چلاتے اور سیاست میں ادب کو گھساتے گھساتے، مصلحتوں کے آگے گھٹنے ٹیکتے ٹیکتے اور ہر بدلی ہوئی صورتحال کے آگے اپنے چہروں کو بدلتے بدلتے اب ان کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی انہیں ان کا اپنا اصلی چہرہ بھی دکھا دے تو شاید وہ اسے پہچان نہ سکیں۔ بے چہرگی کے اس ماحول میں اگر پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنے اصلی چہرے کو جیوں کا تیوں باقی رکھا ہے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور شکیل بھائی کا یہی گمبھیر اور پُر عزم چہرہ مجھے بے حد عزیز ہے جو اپنی زبان سے کچھ نہیں بھی کہتا، پھر بھی اپنی خاموشی سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ میں شکیل بھائی کو ان کے رکن پارلیمنٹ بننے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(1991)

☆☆

www.taemeernews.com

پروفیسر قمر رئیس

پچھلے دنوں دہلی کی ایک سماجی محفل میں ایک روسی سفارت کار سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے پوچھا "کیا حال ہے سوویت یونین کا؟"

سفارت کار نے ہنستے ہوئے کہا "کچھ کہنا مشکل ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے حالات ذرا مختلف ہیں۔ کیونکہ دنیا کے سارے ممالک کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی لیکن سوویت یونین دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کے ماضی کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا مشکل ترین کام ہے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کل کے دن ہمارے ماضی میں کیا ہونے والا ہے۔ ہمیں تو ہر دم مستقبل کی نہیں ماضی کی فکر لاحق رہتی ہے۔"

پروفیسر قمر رئیس کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنے سے پہلے اگر میرے ذہن میں اچانک سوویت یونین کا خیال آ گیا تو کوئی غلط نہیں آیا۔ "کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا" والا معاملہ ہے۔ کیونکہ قمر رئیس اور سوویت یونین کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ قمر رئیس سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۳ء میں روسی سفارت خانہ کی ایک محفل میں ہی ہوئی تھی جس میں بنے بھائی مرحوم بھی موجود تھے۔ یوں بھی قمر رئیس اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ سوویت یونین میں گزار چکے ہیں اور خیر سے اب وہ نہایت نیک نامی کے ساتھ یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ گویا اب ان کی زندگی میں اتنا ماضی جمع ہوگیا ہے کہ اس کے بارے میں ہم جیسے احباب کو پیشین گوئی کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

اٹھاون برس کی عمر ایک آدمی کی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یوں بھی آدمی برسر خدمت ہو تو اس کی خدمت کا پوری غیر جانبداری اور دیانتداری

www.taemeernews.com

کے ساتھ جائزہ لینا دشوار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یہی ریت چلی آرہی ہے۔

مندرجہ بالا ضمنی باتوں سے قطع نظر قمر رئیس کے ذکر کے ساتھ میرے ذہن میں سوویت یونین کا خیال آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قمر رئیس سے میری شخصی ملاقات کے پورے تیرہ چودہ برسوں بعد ان کی عظمت کا راز مجھ پر اسوقت منکشف ہوا جب مجھے تین برس پہلے سوویت یونین جانے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے میں ان کی علمیت سے آگاہ تو تھا ہی لیکن ان کی عظمت سے قطعاً نا آشنا تھا۔ تاشقند کی سرزمین پر میری پہلی ملاقات جس شخص سے ہوئی وہ ہمارے مترجم اور ترجمان میاں رخصت الا ئیو غفور جہاں گستری تھے جو سوویت یونین کے اشاعتی ادارہ ''رادوگا'' میں اردو زبان کے سربراہ ہیں۔ ابتدائی دو تین تعارفی کلمات کے بعد ہی انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا ''کیا آپ پروفیسر قمر رئیس کو جانتے ہیں؟''
میں نے کہا ''مان لیجئے اگر میں یہ کہوں کہ میں پروفیسر قمر رئیس کو نہیں جانتا تو میرے اس بیان کا آپ پر کیا ردعمل ہوگا۔''

وہ بولے ''تب تو مجھے آپ کی اردو دانی پر شک کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔''

غفور جہاں گستری کے اس جواب سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگئی کہ موصوف قمر رئیس کے نہ صرف قایل ہیں بلکہ قتیل بھی ہیں۔ دیارِ غیر میں یوں بھی بہت سوچ سمجھ کر اور آگے پیچھے دیکھ کر بات کرنی پڑتی ہے۔

میں نے کہا ''قمر رئیس تو میرے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ ابھی کل ہی کی رات تو ہم دونوں ساتھ تھے۔ (حالانکہ قمر رئیس سے مجھے ملے ہوئے دو مہینے ہوگئے تھے) انہوں نے تاشقند میں اپنے کچھ دوستوں کے پتے اور ٹیلیفون نمبر مجھے لکھوائے ہیں کہ تاشقند جاؤ تو ان سے مل لینا۔''

غفور جہاں گستری نے نہایت اعتماد کے ساتھ کہا ''تب تو انہوں نے میرا پتہ اور ٹیلی فون بھی لکھوایا ہوگا۔'' (اب آپ سے کیا چھپانا قمر رئیس نے مجھے اپنے چند دوستوں اور شاگردوں کے پتے ضرور ٹیلی فون پر لکھوائے تھے لیکن اس میں غفور جہاں گستری کے پتے کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔)

www.taemeernews.com

میں نے غفور جہاں گستری کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا "غفور صاحب! قمر رئیس کی فہرست میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔"

حیرت سے بولے "سچ!"

میں نے کہا "اور کیا؟"

بولے "مجھے ذرا وہ پتوں کی فہرست تو دکھائیے۔"

میں نے کہا "تو کیا آپ اس فہرست کی مدد سے اپنا پتہ جاننا چاہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے گھر کا پتہ بخوبی جانتے ہیں۔"

غفور جہاں گستری میرے اس جواب سے شرما گئے نظریں نیچی کر کے بولے "ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میرے علاوہ تاشقند میں کس کس کو عزیز رکھتے ہیں۔ قمر صاحب میرے استاد ہیں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں اور میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔ میں نے انہیں سے اردو سیکھی ہے۔"

میں نے مذاق میں کہا "تبھی تو آپ قمر رئیس سے کہیں زیادہ اچھی اردو بول لیتے ہیں۔" ہنس کر بولے "غفور نوازی کا شکریہ! آپ مذاق بہت اچھا کر لیتے ہیں۔"

غفور جہاں گستری چار دنوں تک ازبکستان میں ہمارے مترجم اور رہنما بنے رہے اور ان پورے چار دنوں میں ہماری معرفت وہ اپنے اندر قمر رئیس کی یاد کو چمکاتے اور مہکاتے رہے۔ ہمیں علی شیر نوائی تھیٹر کو دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ وہ بولے "آئیے پہلے وہ گھر دیکھ لیتے ہیں جس میں پروفیسر قمر رئیس اپنے قیام تاشقند کے زمانے میں رہا کرتے تھے۔" (یہ مقام ہمارے سرکاری دورے میں شامل نہیں تھا۔)

قمر رئیس کے تاشقند والے گھر کو یوں دکھایا جیسے یہ ایک میوزیم ہو۔ باغ شعرا کو دیکھنے کے لئے چلے تو راستے میں اُن اُن مقامات کی نشاندہی کرتے گئے جہاں جہاں پروفیسر قمر رئیس کا آنا جانا تھا یا جہاں جہاں ان کے نقشِ قدم کے پائے جانے کا اندیشہ تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم ازبکستان کی سیر کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ پروفیسر قمر رئیس کی عظمتِ رفتہ کے نشان تلاش کرنے آئے ہیں۔ غفور جہاں گستری پر ہی کیا موقوف ازبکستان

www.taemeernews.com

کے سارے اردو اداروں اور درسگاہوں میں قمر رئیس کے رعب اور دبدبہ کو دیکھا۔ ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ ہم جس ہوٹل میں مقیم تھے وہاں اچانک سکیوریٹی کے انتظامات سخت کر دیئے گئے۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا "آج یہاں سکیوریٹی کا انتظام کچھ زیادہ ہی سخت معلوم ہوتا ہے۔ کیا کوئی خاص مہمان اس ہوٹل میں مقیم ہے؟"

بولے "آپ کو شاید پتہ نہیں کہ آپ سے ملنے کے لیے جناب فتح تیشہ بایف اس ہوٹل میں آرہے ہیں۔ ازبکستان کے سربراہانِ مملکت میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔" (ان دنوں فتح تیشہ بایف ماسکو میں سینٹرل کمیونسٹ پارٹی کے نہایت اہم عہدہ پر فائز ہیں۔) غرض فتح صاحب آئے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ابتدائی دو تین تعارفی کلمات کے بعد انہوں نے بھی غفور جہاں گستری کی طرح پروفیسر قمر رئیس کا حال پوچھ لیا۔ پتہ چلا کہ موصوف قمر رئیس کے چہیتے شاگرد رہ چکے ہیں۔ بڑی فصیح اور بلیغ اردو بولتے ہیں۔ غرض سوویت یونین میں جہاں جہاں اردو والے ملے قمر رئیس کا ذکر بھی آ گیا۔

پتہ چلا کہ سوویت یونین میں باضابطہ طور پر اردو تعلیم کا آغاز قمر رئیس کی کوششوں سے ہی ہوا۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے وہاں اردو کتابوں کا نصاب مرتب کیا اور اردو تعلیم کے لیے ایک باضابطہ منصوبہ پیش کیا۔ اب سوویت یونین کے اردو والے قمر رئیس کی عزت کرتے ہیں تو غلط نہیں کرتے۔ سوویت یونین کے دورے سے واپسی پر میں نے سوویت یونین کے اردو والوں کا شکریہ ادا کیا کہ اگر میں سوویت یونین نہیں آتا تو مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ قمر رئیس کتنے عظیم انسان ہیں۔ اپنی کم علمی اور جہالت پر رونا آیا۔ اس دورے کا ایک ذاتی نقصان مجھے یہ ہوا کہ اب میں قمر رئیس سے اس طرح نہیں ملتا جیسا کہ دورۂ سوویت یونین سے پہلے ملا کرتا تھا۔ اب وہ ملتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ان کا احترام کروں حالانکہ ان سے میری خاصی بے تکلفی رہی ہے۔

قمر رئیس سے دوستی کی کئی خوشگوار یادیں ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں نیا نیا دلّی آیا تھا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کیا کرتا تھا۔ ان کے گھر پر بھی اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ قمر رئیس نے دہلی میں اپنا گھر ایسی جگہ بسا رکھا ہے کہ

www.taemeernews.com

وہاں جانے سے پہلے اکثر سوچتا ہوں کہ ان کے گھر جانے کی بجائے حیدرآباد ہی کیوں نہ چلا جاؤں۔ بھلے ہی ان کے گھر جانے میں آمد و رفت کا کرایہ کم لگتا ہو لیکن سفر کی صعوبتیں تو اتنی ہی برداشت کرنی پڑتی ہیں جتنی کہ حیدرآباد کے سفر میں پیش آسکتی ہیں۔ یوں بھی جوں جوں عمر میں اضافہ ہوتا جارہا ہے میرا ذوقِ سفر بھی کم ہوتا جارہا ہے۔ لہٰذا اب ان کے گھر کم ہی جاتا ہوں لیکن مجھے یاد ہے کہ نئے سال کی کئی شامیں قمر رئیس کے گھر پر ہی گزریں اور جب جب گزریں وہ سال اچھا ہی گذرا۔ قمر رئیس کے ساتھ ہندوستان کے کئی شہروں کا سفر بھی کیا۔ قمر رئیس اچھے نقاد اور اچھے استاد ہونے کے علاوہ ایک اچھے ہم سفر بھی ہیں۔ پٹنہ کی طنز و مزاح کانفرنس میں مجھے ان کا ہم سفر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ دلی سے ٹرین میں سوار ہوتے ہی وہ الہ آباد کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے پوچھا ''کوئی خاص بات ہے کیا؟ کیا الہ آباد اسٹیشن پر آپ سے کوئی ملنے کے لئے آئے گا؟''

بولے ''الہ آباد کے امرود بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انھیں خریدنا ہے۔'' میں نے کہا ''اور یہ جو آپ نے زادِ راہ کے طور پر اپنے ساتھ اتنے سارے سیب، سنگترے، کیلے اور امرود رکھے ہیں تو ان کا کیا ہوگا'' بولے ''پٹنہ کا سفر بھی تو خاصا طویل ہے۔''

شدید انتظار کے بعد جب الہ آباد آیا تو قمر رئیس نے ڈھیر سارے امرود خریدے۔ انھیں خرید کر بہت خوش تھے۔ امرودوں کو بڑی نفاست کے ساتھ کاٹ کاٹ کر مجھے پیش کرتے جاتے تھے۔ جتنے امرود اس سفر میں کھائے کبھی نہیں کھائے۔

پھل قمر رئیس کی کمزوری ہیں۔ کشمیر کے سفر میں انھوں نے مجھے اتنی چیریز کھلائیں کہ اس کے بعد چیریز سے نفرت سی ہوگئی۔ پھلوں کے لئے قمر رئیس کی رغبت کا ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔ چار پانچ برس پہلے میں اور قمر رئیس ایک دوست کی گاڑی میں علی گڑھ سے دہلی واپس آرہے تھے۔ آموں کا موسم تھا۔ خورجہ پر ہم چائے پینے کے لئے رُکے تو ایک آم بیچنے والا میرے پیچھے پڑ گیا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کچھ آم خریدے تو قمر رئیس نے غالباً یہ سوچ کر کہ میں پھلوں کے معاملہ میں ان سے کس طرح سبقت لے جاسکتا ہوں، مجھ سے کہیں زیادہ آم خرید لیے۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ قمر رئیس کے آم خرید

www.taemeernews.com

نے کے عمل میں مسابقت کا پہلو پوشیدہ ہے تو میں نے بلند شہر پر ضد میں کچھ اور آم خرید لیے اور قمر رئیس نے اس کے جواب میں دوگنے آم خرید لیے۔ غازی آباد پر بھی ہم دونوں میں مسابقت کا سلسلہ جاری رہا۔ نوبت یہاں تک آئی کہ ساری گاڑی آموں سے لد گئی۔ جس دوست کی گاڑی میں ہم علی گڑھ سے چلے تھے ان سے یہ طے تھا کہ وہ قمر رئیس کو دہلی کی سرحد پر کسی موزوں مقام پر اتار دیں گے اور وہاں سے قمر رئیس کسی سواری کا بندوبست کر کے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ چنانچہ دہلی کی سرحد پر قمر رئیس کو اُن کے آموں سمیت اتارا گیا۔ آموں کی کئی ٹوکریاں سڑک کے کنارے سجا کر قمر رئیس کسی سواری کا انتظار کرنے لگے اور ہم لوگ برابر ہی ایک ہوٹل میں چائے پینے کے لیے چلے گئے۔ وہ مقام ایسا تھا کہ وہاں سے کسی سواری کا ملنا دشوار نظر آتا تھا۔ ہم نے ہوٹل میں سے قمر رئیس کو دیکھا کہ آموں کی ٹوکریوں کو سڑک پر سجائے سواری کا انتظار کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک موٹر ان کے برابر آکر رکی اور اندر سے ایک خاتون نے قمر رئیس سے پوچھا "بھیا! آم کس بھاؤ دو گے؟"

قمر رئیس کا پٹھانی خون جوش میں آگیا۔ اُسی وقت ہمارے ڈرائیور کو طلب کیا اور سارے آم دوبارہ گاڑی کے اندر رکھوا دیئے۔ پھر کسی قدر خفگی کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے "بھیا! ان آموں کو بھی تم ہی کھالینا۔ میں یہاں سے پیدل چلا جاؤں گا۔" اور اُس دن مجھے احساس ہوا کہ اندھی مسابقت کتنی خطرناک چیز ہوتی ہے۔

قمر رئیس خوش گوار موڈ میں ہوں تو اپنے ماضی کے قصے مزے لے لے کر سناتے ہیں۔ ایک بار کشمیر میں ایک ہفتہ کا ساتھ رہا۔ کشمیر کے جان لیوا موسم کا جادو اُن پر اثر کرنے لگا تو انھیں بے ساختہ وہ گلیاں یاد آنے لگیں جن میں انھوں نے اپنی جوانی کھوئی تھی۔ قمر رئیس حسن کے دلدادہ ہیں۔ جہاں کہیں بھی اور جس کسی میں بھی انھیں حسن نظر آتا ہے ان کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ پلک جھپکائے بغیر حسن کو دیکھنا کوئی قمر رئیس سے سیکھے۔

ان کی جو ادا مجھے بہت پسند ہے وہ اُن کی لاجواب حسِ مزاح ہے۔ میں نے اردو کے بہت کم استادوں کو بے لوث قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُردو کے بیشتر استادوں کے قہقہہ میں ہمیشہ کسی نہ کسی اور جذبہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے جب کہ قمر رئیس خالص قہقہہ

www.taemeernews.com

لگانے کے عادی ہیں۔

میں اس کا اہل نہیں ہوں کہ قمر رئیس کی تنقیدی بصیرت اور ادب میں ان کے بلند مرتبے کے بارے میں اظہارِ خیال کروں۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ قمر رئیس اردو کے ان پروفیسروں سے مختلف ہیں جو آئے دن سازشوں میں مبتلا رہتے ہیں اور جو علمیت کو چالاکی اور چالاکی کو علمیت سمجھتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے منصب کو حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی ذلت برداشت کر لیتے ہیں۔ سیاست داں بھی اپنی وفاداریاں اس طرح تبدیل نہیں کرتے جس طرح یہ کرتے ہیں۔ غیبت، مکر و فریب اور دھاندلی ان کے کردار کے بنیادی وصف بن چکے ہیں۔ انعامات اور اعزازات کے حصول کے لیے جگہ جگہ اپنے آپ کو ذلیل کرواتے پھرتے ہیں۔ اردو کے ان نام نہاد بڑوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اتنا چھوٹا بھی ہو سکتا ہے۔ اردو کے اس زوال آمادہ معاشرہ میں قمر رئیس جیسے بے لوث اور خالص دانشور کی موجودگی ایک نیک فال ہے۔ انھوں نے اردو کی کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کے شاگرد اردو کے اُس کلچر کی حفاظت کریں گے، جس کا خمیر خودداری اور خوداعتمادی سے اٹھا ہے۔ قمر رئیس بنیادی طور پر نہایت مخلص انسان ہیں۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے مجھے ہمیشہ اپنے خلوص اور محبت سے نوازا۔ کبھی کبھی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن قمر رئیس نے ہمیشہ اپنا دل بڑا رکھا۔ کبھی اپنی زبان پر شکایت کو نہ آنے دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے کہنے سے قمر رئیس نے بعض ایسے کام بھی کیے جو وہ عام حالات میں نہ کرتے۔

قمر رئیس جیسے کرم فرما اور دوست اس دنیا میں موجود ہوں تو زندگی بہت بھلی لگتی ہے اور اسے گزارنے میں اتنی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں ان کی دوستی کو ایک قیمتی اثاثہ تصور کرتا ہوں۔

(1991)

☆☆

www.taemeernews.com

قتیل شفائی

ہمارے دوست دیویندر گوسوامی (جو دہلی ٹیلی ویژن کے سابق ڈائریکٹر رہ چکے ہیں) بنیادی طور پر اردو کے ادیب ہیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے بے مثال ڈرامے لکھے ہیں۔ دو تین برس پہلے ان کی ایک ٹیلی فلم "دو حرف ادھورے سے" نیشنل نٹ ورک پر دکھائی گئی تھی۔ اس فلم میں شوبھنا جگدیش نے، جو ان دنوں ٹیلی ویژن پر ہندی میں خبریں پڑھتی ہیں، لاجواب اداکاری کی تھی۔ ساری فلم ایک ہی کمرہ میں چلتی ہے اور فلم میں کردار صرف دو ہیں۔ سارا کمال اس فلم کے مکالموں میں مضمر ہے اور یہ کمال دیویندر گوسوامی کا ہے۔

دیویندر گوسوامی کو جب بھی اردو کی پرانی محفلیں اور رونقیں یاد آتی ہیں تو ہماری طرح صرف دل مسوس کر نہیں رہ جاتے بلکہ اپنے آپ کو اردو کے بچے کھچے ماحول سے جوڑنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ملے تو کہنے لگے "دن رات ایک ہی طرح کا کام کرتے کرتے اور ایک ہی طرح کے ماحول میں رہتے رہتے اُکتا گیا ہوں۔ کسی دن اپنے شاعر اور ادیب دوستوں کو میرے ہاں بلاؤ تاکہ شعر و ادب کا بازار گرم ہو۔ کچھ گیسوئے خم دار کی باتیں ہوں۔"

ہم نے کہا "اس کام کے لیے قتیل شفائی نہایت موزوں رہیں گے۔"

حیرت سے بولے "لیکن قتیل شفائی کہاں سے دستیاب ہوں گے؟"

ہم نے کہا "قتیل شفائی ان دنوں ہندوستان میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کل بمبئی سے دہلی آرہے ہیں۔ کہیے تو کل کی شام ان سے منسوب کردی جائے۔"

www.taemeernews.com

اگر چہ قتیل شفائی اپنی بزرگی کے باوجود اب ہم سے نہایت دوستانہ انداز میں ملتے ہیں لیکن یہ بات ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ نوجوانی میں ہم ان کی غزلوں اور گیتوں کے بے پناہ مداح رہ چکے ہیں (اب بھی ہیں)۔ ہمیں یاد ہے کہ آج سے پینتیس (۳۵) برس پہلے حیدرآباد کے اورینٹ ہوٹل میں جب نیا نیا "جیوک باکس" لگایا گیا تھا جس میں ریزگاری ڈال کر اپنے پسندیدہ گیت سنے جا سکتے تھے تو اس ہوٹل میں ایک عرصہ تک صبح سے شام تک جو ایک ہی گیت اکثر سنا جاتا تھا وہ تھا۔

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اقبال بانو کے گائے ہوئے اس گیت کو پسند کرنے والے یوں تو بہت سے ہوں گے لیکن ہم اور ہمارا دوست تقی تنویر (جو اب لندن میں رہتا ہے) اپنے ساتھ ریزگاری لے کر ہوٹل میں جاتے ہی اس لیے تھے کہ اس گیت کو سنا جائے۔ نیم بیروزگاری کے دن تھے۔ ایسے میں ریزگاری بھی بڑی مشکل سے فراہم ہوتی تھی۔ چونکہ ہماری بدولت یہ گیت، چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، اسے چوبیسوں گھنٹے سنا مشکل تھا، شاذ تمکنت جو بیگم اختر کے گیت سننے کے متمنی رہتے تھے اور اوپر سے ریزگاری بھی اپنے ساتھ نہیں لاتے تھے اکثر ہم سے کہتے تھے بھیا! ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ ہمیں بیگم اختر کی گائی ہوئی کوئی غزل تو سنوادو اور کبھی کبھی ہم ان پر ترس کھا کر بیگم اختر کا ریکارڈ بھی بجوادیتے تھے۔ ان دنوں ہمارے دل ابھی اتنے نہیں ٹوٹے ہوئے تھے جتنے کہ آج ٹوٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اس گیت میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ ہر دم اس کے سحر میں ڈوبے رہتے تھے۔

قتیل شفائی ایک عرصہ تک ہندوستان نہیں آئے مگر سات آٹھ برس پہلے ان کا ہندوستان آنا جانا شروع ہوا تو کچھ اس طرح کہ سال میں ان کے دو ایک پھیرے ضرور لگ جاتے ہیں۔ اب تو بمبئی میں وہ مہیش بھٹ کی فلم کے لیے گانے بھی لکھ رہے ہیں۔ آتے ہیں

www.taemeernews.com

تو دو تین مہینے ہندوستان میں ضرور گزارتے ہیں۔ جب بھی دہلی آتے ہیں تو ان کی پہلی شام اکثر ہمارے ساتھ ہی گذرتی ہے۔ اس شام دیویندر گوسوامی کے ہاں پانچ چھ احباب جمع تھے۔ شردوت، اونار سنگھ جج، کے ایل نارنگ ساقی (جن کے ہاں قتیل شفائی مقیم ہوتے ہیں) کے علاوہ پاکستان کے مقبول ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر اور شاعر اظہر جاوید بھی تھے جو اسی شام لاہور سے ہندوستان آئے تھے۔ ان دونوں کو دوسرے دن شملہ کے کسی مشاعرہ میں جانا تھا۔ دیویندر گوسوامی تو خیر قتیل شفائی سے شعر سننا چاہتے تھے لیکن ہماری دلچسپی تو اس میں تھی کہ ان سے پاکستان کے موجودہ سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامہ پر بات کی جائے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس بار قتیل شفائی نے بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم میں راست طور پر حصہ لیا تھا۔ پاکستان میں حبیب جالب اکیلے شاعر تھے جو اس طرح کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لیتے تھے ورنہ پاکستان کے اکثر شاعر اور ادیب فوجی حکمرانوں کے ڈر سے اپنے آپ کو سیاست سے دور ہی رکھتے آئے ہیں۔ جب ہم نے قتیل شفائی سے عملی سیاست میں راست طور پر حصہ لینے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے سیاسی حالات کچھ ایسا موڑ اختیار کر گئے تھے جہاں لکھنے والوں کا خاموش رہنا خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ادب اور ادیب دونوں کی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ دن بہ دن مُلّائیت بڑھتی جا رہی تھی اور ہر طرح کی لوٹ مار جاری تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سابق چیف منسٹر آفتاب احمد شیرپاؤ نے پشاور میں بے نظیر بھٹو کی حمایت میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا جس میں ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ میں نے اس جلسہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کا آغاز کیا اور اس میں بے نظیر کی حمایت میں کئی قطعات اور نظمیں سنائیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ "جنگ" میں روزانہ لکھتا رہا۔ جب بے نظیر بھٹو انتخابات میں جیت کر آگئیں تو میں نے شعر کہا تھا۔

سیکھے کوئی سپہ گری بے نظیر سے
دو دشمنوں کو مار دیا ایک تیر سے

دو دشمنوں کا اشارہ غلام اسحٰق خاں اور نواز شریف کی طرف ہے۔ اور "تیر"

www.taemeernews.com

پاکستان پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان ہے۔نواز شریف نے اپنے اقتدار اور پیسے کے بل بوتے پر بھٹو خاندان کو ہر طرح ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی۔ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری کے خلاف دس جھوٹے مقدمات دائر کئے گئے جن میں سے نو مقدمات کو عدالتوں نے خارج کرتے ہوئے آصف زرداری کو باعزت طور پر بری کردیا۔"

جب ہم نے اس افراتفری اور دھاندلی کے خلاف پاکستان کے دیگر اخبار نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے رویہ کے بارے میں دریافت کیا تو اظہر جاوید نے ہمیں بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا "پاکستان کے بیشتر اخبار نویسوں کو حکومت نے خرید رکھا تھا۔اگر آٹھ اخبار نویس ہیں تو ان میں سے سات کو حکومت نے خرید لیا تھا۔"

شر دوت نے پوچھا "اور آٹھواں اخبار نویس کیا کر رہا تھا؟"

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا " غالباً اپنے بکنے کے لیے کسی اچھے دام کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

قتیل شفائی نے کہا " کچھ اخبار نویسوں اور ادیبوں نے کھل کر اور کچھ نے دبے لفظوں میں اس دھاندلی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔مثال کے طور پر "جنگ" کے کالم نگار ارشاد حسین حقانی نے کھلے لفظوں میں حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف لکھا۔احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنے انداز میں اپنے کالم میں لکھا۔جب ملک کسی بحران سے گزر رہا ہوتو اس ملک کے ادیبوں اور فنکاروں کا غیر جانبدار بنے رہنا کبھی اچھا نہیں ہوتا۔"

مرتضٰی بھٹو کی واپسی کے بارے میں قتیل شفائی نے کہا کہ مرتضٰی بھٹو کے خلاف جتنے مقدمات بنے ہوئے ہیں جب تک وہ ان سے باعزت بری نہ ہوجائیں گے تب تک ان کا عملی سیاست میں حصہ لینا مناسب نہیں ہوگا۔

اس شام قتیل شفائی نے اپنی کئی غزلیں سنائیں۔اظہر جاوید نے بھی اپنا کلام سنایا۔دیویندر کو سوامی کا داد دیتے دیتے برا حال تھا۔اتنے میں دیویندر کو سوامی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں قتیل شفائی کی شاعری کے دو مجموعے تھے جو کئی برس پہلے لاہور سے شائع ہوئے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ

www.taemeernews.com

قتیل شفائی ان مجموعوں پر اپنے دستخط کر دیں۔ ایک سچے شاعر کی طرح قتیل شفائی نے دستخط تو بعد میں کئے مگر ان بیس پچیس برس پہلے چھپے ہوئے مجموعوں میں سے اپنا تازہ کلام بھی ہمیں سنایا۔ یوں قتیل شفائی نے اس شام ہمیں نہ صرف اپنا کلام سنایا بلکہ مجموعہ کلام بھی سنایا۔

ہمارے لیے یہ بات باعث افتخار ہے کہ قتیل شفائی ہمیں بے حد عزیز رکھتے ہیں اور کم از کم ہندوستان میں ہماری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ (اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم کے گہرے دوست رہ چکے ہیں)۔ ایک بار ہم ان سے ڈانٹ بھی سن چکے ہیں۔ ہوا یوں کہ پانچ برس پہلے ہمیں تین چار دنوں کے لیے لاہور جانا پڑ گیا۔ لاہور پہنچ کر انہیں فون کیا تو پتہ چلا کہ کسی مشاعرہ کے سلسلہ میں لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ دو چار دنوں میں واپس آجائیں گے۔ لاہور سے کراچی واپس ہوتے وقت ہم نے انہیں فون کیا تو واپس آچکے تھے۔ بے حد خوش ہوئے۔ بولے "فوراً چلے آؤ"۔ جب ہم نے انہیں بتایا کہ کچھ ہی دیر بعد ہم لاہور سے روانہ ہو رہے ہیں تو بے حد خفا ہوئے۔ اتنے خفا ہوئے کہ ہمیں مجبوراً ٹیلی فون کے ریسیور کو اپنے کان سے دور ہٹانا پڑا۔ دو منٹ گزر جانے کے بعد جب ہم نے پھر ریسیور کو اپنے کان سے لگایا تو بدستور ہم پر برسے چلے جا رہے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ اس دن انہوں نے ہمیں کیا ڈانٹ پلائی۔ سنتے تو پتہ چلتا۔ یوں بھی بزرگوں کی ڈانٹ سننے کے لیے نہیں ہوتی صرف محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد دہلی آئے تو ہر دوست سے شکایت کرتے رہے کہ ہم لاہور آکر ان کے گھر نہیں آئے۔

قتیل شفائی اب پچھتر برس سے زیادہ کے ہو گئے ہیں لیکن حوصلہ اب بھی نوجوانوں کا سا رکھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہوں اور دونوں ملکوں کے ادیبوں اور ان کی کتابوں کا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنا آسان ہو جائے۔

(1993)

☆☆

www.taemeernews.com

پروفیسر رشید الدین خاں

کرم فرما تو ہمارے بہت سے ہیں لیکن ہم پر کرم فرمانے کا انداز سب کا مختلف ہوتا ہے۔ چھ سات برس پہلے ہم پاکستان گئے تھے تو ہم نے اپنے دو پاکستانی کرم فرماؤں خواجہ حمید الدین شاہد اور مشفق خواجہ کے انداز کرم کے بارے میں لکھا تھا کہ خواجہ حمید الدین شاہد کرم فرماتے ہیں تو لگتا ہے جیسے رحم فرما رہے ہیں اور مشفق خواجہ کرم فرماتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ستم فرما رہے ہیں۔ گویا ہمارے بہت سے کرم فرما' کرم فرمانے کی آڑ میں کچھ اور ہی فرماتے رہتے ہیں۔ پروفیسر رشید الدین خاں ہمارے ان کرم فرماؤں میں ہیں جو کرم فرماتے ہیں تو تب بھی لگتا ہے کہ کرم ہی فرما رہے ہیں کچھ اور نہیں فرما رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ہم پروفیسر رشید الدین خان کے ہاں گئے تو دیکھا کہ بہت سارے ایسے پُرانے کاغذات بکھرائے بیٹھے ہیں جن کا تعلق اس مرحوم حیدرآباد سے تھا جس کے جانے کی جھلک ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ مہاراجا سرکشن پرشاد کے وہ خطوط تھے جو انھوں نے پرفیسر رشید الدین خاں کے والد نواب اکبر یار جنگ کے نام لکھے تھے۔ آغا حیدر حسن کی بھی کچھ تحریریں تھیں۔ سروجنی نائیڈو کے گھر منعقد ہونے والی محفلوں کے دعوت نامے تھے۔ بہادر یار جنگ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں تھیں۔ وہ نہایت جتن کے ساتھ انھیں سینت سینت کے فائیلوں میں رکھتے جارہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو بولے "اچھا ہوا تم آگئے۔ آج میں اپنی زندگی کے اس قیمتی اثاثہ کو سمیٹ رہا تھا جو مجھے بہت عزیز ہے۔ ملکوں ملکوں گھومنے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے باوجود کرۂ ارض کے ایک چھوٹے سے قطعہ ارض پر آباد یہ شہر حیدرآباد اور یہاں کے لوگ نہ جانے کیوں مجھے ہمیشہ یاد

www.taemeernews.com

آتے ہیں۔" ہم نے کہا" آپ کے اس مشکل سوال کا آسان سا جواب یہ ہے کہ آپ خود حیدرآبادی ہیں۔" ہنس کر بولے" میاں! یہ جواب اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ کیسا عجیب و غریب کلچر تھا اس شہر کا۔ زندگی بھر پروفیسر بنے رہنے اور تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہنے کے باوجود اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے کتابوں سے اتنا نہیں سیکھا جتنا کہ اس شہر کی تہذیب سے سیکھا ہے۔"

اس پر ہم نے انھیں ایک دانا کا قول یاد دلایا کہ آدمی زندگی میں ایک بار پروفیسر بن جائے تو زندگی بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے چاہے بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگ جائے۔ یہ سُن کر پروفیسر رشید الدین خاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جو وہ عموماً ایسی باتیں سُن کر لگاتے ہیں۔ وہ اپنے علم و فضل، گہری بصیرت اور وسیع تجربہ کی بنا پر ہمارے بزرگ تو ہیں ہی لیکن اس اعتبار سے بھی ہمارے بزرگ قرار پاتے ہیں کہ وہ ہماری نوجوانی کے دو دوستوں پروفیسر بشیر الدین احمد (موجودہ وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور پروفیسر وحید الدین مرحوم کے بڑے بھائی ہیں۔ یوں بھی خیر سے اب ۷۱ برس کے ہوگئے ہیں لیکن آنکھوں میں نوجوانوں کی سی چمک اور دل میں عاشقوں کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اس حوصلہ کی بنا پر وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے دوستوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ تیس پینتیس برس پہلے کی بات ہے کہ ہم اکبر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں' جو ترپ بازار میں واقع تھی اور جہاں اب ایک شاپنگ کامپلکس بن چکا ہے' پابندی سے جایا کرتے تھے۔ پروفیسر رشید الدین خان ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات کے لکچرار تھے۔ ہمارا ان سے رشتہ سعادت مندی کا تھا جو حیدرآباد میں قیام کے زمانہ میں کبھی "علیک سلیک" سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ ان کے والد اکبر یار جنگ سولہ سال کی عمر میں قائم گنج (اتر پردیش) سے حیدرآباد آئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ قانون کے شعبہ میں اکبر یار جنگ نے جو عزّت حاصل کی وہ حیدرآباد میں بہت کم کے حصہ میں آئی۔ اگر چہ نواب اکبر یار جنگ نے قائم گنج میں اپنی عمر کے صرف سولہ برس گزارے تھے اور باقی ساری عمر حیدرآباد میں گزاری لیکن اس کے باوجود وہ قائم گنج جاتے تو کہتے تھے کہ لو بھئی ہم

www.taemeernews.com

اپنے گھر آ گئے۔ جبکہ پروفیسر رشید الدین خاں نے حیدرآباد میں پیدا ہونے کے بعد لگ بھگ تین دہے حیدرآباد میں گزارے اور ادھر چار دہوں سے حیدرآباد سے باہر مقیم ہیں اور اکثر اپنی علمی مصروفیات کے سلسلہ میں بیرونی دوروں پر ملک سے باہر بھی جاتے ہیں مگر حیدرآباد سے اتنے لمبے عرصہ تک دور رہنے کے باوجود وہ اب بھی حیدرآباد کو ہی اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ وہ حیدرآباد کے گرامر اسکول اور مدرسہ عالیہ کی پیداوار ہیں۔ بعد میں انھوں نے علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا اور نظام کالج میں داخل ہو گئے۔ علی گڑھ میں پرفیسر رشید احمد صدیقی اور نظام کالج میں داخل ہو گئے۔ علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور نظام کالج میں آغا حیدر حسن ان کے اردو کے استاد رہے۔ اپنی اردو دانی اور انگریزی دانی کے بارے میں نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ میں نے اردو آغا حیدر حسن سے اور انگریزی پروفیسر حسین علی خاں سے سیکھی ہے۔ آغا حیدر حسن نے آج سے پچاس برس پہلے کلاس روم میں ان کے جواب نامہ کو دیکھ کر ان کے بڑے آدمی بننے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ ویسے آٹھ دس سال کی عمر میں انھیں دیوان غالب زبانی یاد تھا (اب بھی یقیناً یاد ہوگا) حیدرآباد کو وہ جب بھی یاد کرتے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں حیدرآباد کی تہذیب ایسی جامع اور مکمل تھی کہ اپنے آپ ہی نوجوانوں کی ہمہ گیر ذہنی نشو و نما ہو جاتی تھی۔ اگرچہ جاگیردارانہ ماحول تھا لیکن ہر طرف کچھ ایسی روشن خیالی تھی کہ کبھی جاگیردارانہ ماحول میں رہنے کا احساس نہیں ہوا۔ حیدرآباد میں مذہبیت ضرور تھی لیکن فرقہ پرستی اور تعصب بالکل نہیں تھا۔ کہنے لگے "بہادر یار جنگ مجلس اتحاد المسلمین کے رہنما تھے۔ میرے والد کو چچا کہتے تھے اور اکثر ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ سروجنی نائیڈو بھی بہادر یار جنگ کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ حیدرآباد کی تہذیب وسیع المشربی اور روشن خیالی سے عبارت تھی۔ آج ہم ان عناصر کو ملک میں پھر سے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں ان کے سرے نہیں ملتے۔"

رشید الدین خاں ابتدا ہی سے تدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے ہیں۔ برسوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر اور صدر نشین رہے۔ بارہ برسوں تک

www.taemeernews.com

راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ انھیں جو اعزازات ملے انھیں بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان دنوں وہ جامعہ ہمدرد میں وفاقی مطالعات کے شعبہ کے اعزازی ڈائرکٹر ہیں۔ سیر و سیاحت بھی انھوں نے بہت کی ہے۔ دنیا کے پچاس سے زیادہ ممالک میں جا چکے ہیں۔ (جغرافیہ میں ہم یوں بھی کمزور ہیں۔ ان کی سیر و سیاحت کے حوالہ سے ہی ہمیں پتا چلا کہ دنیا میں پچاس سے زیادہ ملک آباد ہیں)۔

پروفیسر رشید الدین خاں ہمیں اس لیے بھی پسند ہیں کہ وہ ملک کے ان چند دانشوروں اور اہل علم میں سے ہیں جو اپنے وسیع علم کا اطلاق عملی زندگی پر بھی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ علم برائے علم کے نہیں بلکہ علم برائے عمل کے قائل ہیں۔ ایسا تجزیاتی ذہن رکھتے ہیں کہ اپنی سوچ کے ذریعہ کسی بھی مسئلہ کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر کئی برسوں سے وہ ہندوستان کے وفاقی ڈھانچے کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لینے اور کثرت میں وحدت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں اور اس ضمن میں ان کے کئی مقالے اور تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ منی شنکر ایّر نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک مضمون میں دنیا کی ان دس بہترین کتابوں کا ذکر کیا تھا جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں ایک کتاب پروفیسر رشید الدین خاں کی بھی ہے۔ ان کی ایک ادا جو مجھے بہت پسند ہے وہ اردو سے ان کی بے پناہ محبت ہے۔ اگرچہ ان کا زیادہ تر عملی سروکار انگریزی زبان سے رہتا ہے لیکن وہ معدودے چند دانشوروں میں سے ہیں جو کسی اردو رسالہ یا اخبار کے لیے مضمون لکھتے ہیں تو راست اردو میں ہی لکھتے ہیں۔ انگریزی میں لکھ کر اس کا اردو میں ترجمہ نہیں کرتے۔ جن دنوں ہم نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اردو شعبہ کے سربراہ تھے تو ہمارے ادارہ نے ان کی ایک کتاب انگریزی میں شائع کی تھی۔ جب اس کے اردو ترجمہ کا مرحلہ درپیش آیا تو پروفیسر رشید الدین خاں نے کہا کہ وہ خود اس ترجمہ پر نظر ثانی کریں گے۔ مسودہ کے ایک ایک اردو لفظ پر انھوں نے گہرا غور کیا۔ بات بات پر صلاح و مشورہ کرتے تھے۔ نتیجہ میں کتاب کا اردو اڈیشن شائع ہوا تو یوں لگا جیسے کتاب انگریزی سے ترجمہ نہیں کی گئی ہے بلکہ راست طور پر اردو میں ہی لکھی گئی ہے۔ ان میں علمی کام کرنے کی

www.taemeernews.com

بے پناہ لگن اور توانائی ہے۔اس لیے وہ بھرپور زندگی جینے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔خدا کے فضل سے وہ حسن پرستی کے جذبہ سے بھی معمور ہیں۔ایک بار وہ ہمارے گھر کھانے پر مدعو تھے۔اردو کی ایک خوش شکل روسی اسکالر بھی کھانے میں شریک تھیں۔یہ جانے بغیر کہ روسی اسکالر اردو جانتی ہیں پروفیسر رشید الدین خاں نے ان کے حسن کی تعریف میں اردو شعرا کے شعر سنانے شروع کر دیے۔چار پانچ شعروں کے بعد جب روسی اسکالر نے خالص اردو میں کہا'' آپ کی ذرہ نوازی اور حسن پرستی کا شکریہ''تو رشید الدین خاں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا'' اچھا تو آپ کو پتا چل گیا کہ آپ کتنی حسین ہیں۔ہم آپ کو حسن بے پرواہ کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔''ہمیں ان کے منہ سے یہ باتیں بہت اچھی لگتی ہیں کیونکہ ستر سال کے ہو جانے کے باوجود وہ اب بھی ایک وجیہہ و شکیل شخصیت کے مالک ہیں۔

(1995)

www.taemeernews.com
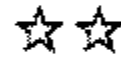
ابراہیم شفیق

کوئی آٹھ دن پہلے ابراہیم شفیق میرے ایک اور عزیز دوست ہادی رحیل کے ساتھ میرے دفتر پر ملنے آئے۔سوچا کہ یونہی ملنے آئے ہوں گے مگر ہادی رحیل کو ابراہیم شفیق کے ساتھ دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔کیونکہ ہادی رحیل کسی ادیب یا شاعر کے ساتھ اسی وقت نظر آتے ہیں جب وہ ادیب یا شاعر''صاحب کتاب'' بننے کی تیاریاں کررہا ہوتا ہے۔وہ اس ادیب کی اس وقت تک متواتر مدد کرتے ہیں جب تک کہ وہ ادیب مجبور ہوکر''پیش لفظ''میں ان کا شکریہ نہیں ادا کردیتا۔اب تک کئی کتابوں کے'پیش لفظوں'یا'پیش الفاظ'میں وہ مختلف ادیبوں سے اپنا شکریہ ادا کرواچکے ہیں۔میری کتاب کی اشاعت کے وقت بھی انہوں نے میری مدد کی تھی مگر میں نے جان بوجھ کر اپنی کتاب کے'پیش لفظ'کو ہادی رحیل کے تئیں اپنے شکریہ سے محفوظ رکھا تھا۔وہ ناراض ہوگئے تو میں نے سمجھایا کہ بھئی پیش لفظوں کے ذریعہ ادب میں داخل ہونے کی عادت کچھ اچھی نہیں ہے۔ادب میں آنا ہی ہے تو دھڑلے سے چلے آؤ۔تمہیں کس نے روکا ہے۔ہادی رحیل بہت دوراندیش آدمی ہیں۔اتنے دوراندیش کہ انہوں نے آج سے دس برس پہلے ہی اپنے لیے ایک تخلص کا انتخاب کرلیا ہے۔میں نے ایک دن پوچھا۔''جب تم شعر کہتے ہی نہیں ہو تو تخلص کیوں رکھتے ہو؟''

وہ بولے''بھئی! انسان کا کیا بھروسہ ہے۔کسے معلوم کہ ایک دن اچانک مجھ سے کوئی غزل سرزد ہوجائے۔ایسے وقت میں تخلص کو ڈھونڈنے کہاں جاؤں۔''

ہادی رحیل کا ذکر تو صرف ایک طویل جملہ معترضہ تھا اور ان کا ذکر میں نے صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ ابراہیم شفیق کو ہادی رحیل کے ساتھ دیکھتے ہی میں تاڑ گیا تھا کہ ابراہیم شفیق جو کل تک اچھے بھلے تھے،سب سے ہنس بول رہے تھے،بیٹھے بٹھائے صاحب

www.taemeernews.com

کتاب بن رہے ہیں۔

ابراہیم شفیق کے بارے میں جب بھی بہت کچھ لکھنے کی کوشش کی تو صرف ایک ہی جملہ میرے ذہن میں بار بار آتا رہا کہ "ابراہیم شفیق بڑا معصوم آدمی ہے۔ ان کی معصومیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کے بارے میں مجھ سے مضمون لکھنے کی خواہش کی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں انہیں کم و بیش پندرہ برسوں سے جانتا ہوں اور پندرہ برسوں میں ایک آدمی کی نظر دوسرے آدمی کی خوبیوں پر سے گزر کر اس کی خرابیوں کو تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

پندرہ برس پہلے جب میں آرٹس کالج میں پڑھتا تھا تو ابراہیم شفیق سائنس کالج میں پڑھتے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات میرے ایک اور افسانہ نگار دوست اکرام جاوید نے آرٹس کالج کے ریلوے اسٹیشن پر اس حالت میں کرائی تھی جب ابراہیم شفیق اپنے دوستوں کو اپنا کوئی افسانہ سنا رہے تھے۔ افسانہ سناتے سناتے ابراہیم شفیق نے ایک لمحہ کے لیے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر افسانہ سنانے میں مصروف ہو گئے۔ آدھے گھنٹہ بعد جب افسانہ ختم ہوا تو میری طرف دیکھ کر بولے۔ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

میں نے کہا "مگر آپ کو بڑی دیر سے خوشی ہوئی۔"

جھینپ کر بولے "وہ دیکھئے نا! جب آپ آئے تو افسانہ کلائمکس پر پہنچ چکا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "میرے آنے کی وجہ سے آپ کا افسانہ کلائمکس پر پہنچا تھا یا میرے آنے سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔"

اس کے جواب میں ابراہیم شفیق غالباً ہنس کر خاموش ہو جانا چاہتے تھے کہ اکرام جاوید نے ان کی مدد کو آتے ہوئے کہا "ابراہیم شفیق بڑے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ سائنس کالج میں بی۔ ایس سی کے پہلے سال میں پڑھتے ہیں مگر ادب سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔"

میں نے پھر ابراہیم شفیق سے پوچھا "تو گویا آپ سائنسی افسانے لکھتے ہیں؟"

میرے اس سوال کے جواب میں بھی ابراہیم شفیق مسکرا دیے۔ اس دن کے بعد سے اب تک میں نے ابراہیم شفیق سے مختلف موضوعات پر لاتعداد سوالات پوچھے ہیں اور

www.taemeernews.com

مجھے اپنے ہر سوال کا جواب ابراہیم شفیق کی مسکراہٹ سے ہی ملا ہے۔ اب یہ ایک آدمی کی شرافت نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ پندرہ برسوں سے ہر نامعقول سوال پر صرف مسکرائے جا رہا ہے۔ چاہے یہ سوال میں کروں یا زندگی!

یہ بات ابراہیم شفیق کی شخصیت کے ایک خاص پہلو کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی ''شعر و ادب'' کے معاملہ میں واقعی ایک یونیورسٹی نظر آتی تھی۔ یونیورسٹی کا ہر دوسرا طالب علم یا تو شعر کہتا تھا یا افسانہ لکھتا تھا۔ مجھ جیسے طلبا کی تعداد بہت کم تھی جو صرف ہوٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں شعراء اور افسانہ نگار یونیورسٹی میں ڈھالے جاتے تھے۔ آرٹس کالج کے ریلوے اسٹیشن کے آس پاس بڑی بڑی چٹانیں تھیں جن پر بیٹھ کر طلبہ ٹرینوں کی آمد کا انتظار کیا کرتے تھے۔ یہ چٹانیں مختلف ناموں سے مشہور تھیں۔ ایک چٹان '' افسانہ نگاروں کی چٹان'' کہلاتی تھی۔ دوسری چٹان جو سائز میں ذرا بڑی تھی ''شعراء کی چٹان'' کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ درمیان میں ایک اور چٹان بھی تھی جس پر مجھ جیسے طلبہ بیٹھا کرتے تھے اور یہ ''ہوٹرس کی چٹان'' یا ''نقادوں کی چٹان'' کے نام سے بدنام تھی۔ ان دنوں ادب سے میرا تعلق بالکل ناجائز سا تھا یعنی صرف ہوٹنگ کے ذریعہ ہم لوگوں نے ادب سے اپنا تعلق قائم کر رکھا تھا۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہوٹنگ کرنے کے لیے آدمی کو جتنا ادبی ذوق رکھنا پڑتا ہے غالباً اتنا ادبی ذوق خود شعر کہنے یا افسانہ لکھنے کے لیے درکار نہیں ہوتا۔ میں اکثر اوقات '' افسانہ نگاروں کی چٹان'' کی جانب بھی چلا جایا کرتا تھا اس لیے کہ پیاسے کو کنوئیں کے پاس جانا ہی پڑتا ہے۔ اکرام جاوید اور ابراہیم شفیق کو میں نے ہمیشہ اسی چٹان پر ایک دوسرے کو افسانے سناتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں کے ساتھ اور بھی بہت سے افسانہ نگار ہوا کرتے تھے۔ پندرہ برس پہلے صرف ابراہیم شفیق اور اکرام جاوید کی عمریں ہی کم نہ تھیں بلکہ خود اردو افسانہ کی عمر بھی ذرا مختصر ہی تھی۔ ان دنوں جذباتی اور انقلابی افسانوں کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے اکثر افسانہ نگار ایسے شدید جذباتی افسانے سنایا کرتے تھے کہ انہیں سنا دینے کے بعد ہم لوگ بڑی دیر تک متعلقہ افسانہ نگار کو مضبوطی سے پکڑے رہتے تھے۔ کوئی افسانہ نگار کے منہ پر

www.taemeernews.com

پانی کے چھپاکے مارتا تھا۔کوئی پنکھا جھلتا تھا اورکوئی افسانہ نگار کے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اس کی پیشانی کو دبانے لگتا تھا۔ یہ عمل اس لیے کیا جاتا تھا کہ افسانہ نگار کے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑ جائیں۔ان افسانہ نگاروں میں ایسے افسانہ نگار بھی تھے جن کے افسانوں کے یونیورسٹی بھر میں افسانے مشہور ہوجاتے تھے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یونیورسٹی کے ایک افسانہ نگار کے افسانہ میں سے ہم لوگوں نے جملہ ''چارسوزندگیاں'' برآمد کی تھیں۔یعنی اس افسانہ میں جو بڑی مشکل سے تین صفحوں کا ہوگا''زندگی'' کا لفظ کوئی چارسومرتبہ آیا تھا۔اس کے جملے کچھ اس طرح تھے''آہ زندگی۔زندگی تو کہاں ہے۔میری زندگی بتادے کہ کیامیری بھی کوئی زندگی ہے۔اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔انسان کی زندگی بھی بڑی عجیب زندگی ہے۔آہ۔زندگی۔زندگی۔زندگی۔''

ان دنوں افسانہ الفاظ سے نہیں بلکہ ڈیشس Dashes کی مدد سے لکھا جاتا تھا۔ خودمیں نے ابراہیم شفیق سے ایسے کئی افسانے سنے تھے جو ڈیشس کی مدد سے لکھے گئے تھے۔

افسانوں کے عنوان بھی عجیب وغریب ہوا کرتے تھے۔ان دنوں شولوخوف کا ناول ''اورڈان بہتا رہا'' ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھا اور اسی ناول کے وسیلہ سے اردو میں افسانوں کے ایسے عنوانات کا رواج چل پڑا تھا کہ ''اورٹرین چلتی رہی''،''اور بیمار روتی رہی''،''اورزندگی ہنستی رہی۔''،''اورانسان مرتا رہا۔''،''اورزلزلہ آتا رہا'' وغیرہ وغیرہ۔ابراہیم شفیق اوراکرام جاوید ہمیشہ ایک دوسرے کے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ہم لوگوں نے ان دونوں کی دوستی کو بھی ایک عنوان دے رکھا تھا۔اور وہ عنوان یہ تھا کہ ''اور ابراہیم شفیق افسانے لکھتا رہا اور اکرام جاوید افسانے سنتا رہا۔''

یونیورسٹی کے افسانہ نگار سب کے سب طلبہ تھے۔ظاہر ہے کہ وہ اس میدان میں مبتدی بھی تھے۔اسی لیے ان سے بڑی دلچسپ غلطیاں سرزد ہوجایا کرتی تھیں۔مثلاً ایک افسانہ نگار کا افسانہ اس جملہ پر ختم ہوتا تھا...... ''اور بیچارہ بوڑھا۔رات کو بارہ بجے اس کا

www.taemeernews.com

ہارٹ فیل ہوا اور صبح میں اس کا انتقال ہوگیا۔'' گویا افسانہ کے ہیرو کا ہارٹ فیل ہو جانے کے باوجود اسے مزید چھ چھ گھنٹوں تک زندہ رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ابراہیم شفیق ابتدا میں بے حد جذباتی افسانے لکھا کرتے تھے اور آپ تو جانتے ہیں کہ شدت جذبات میں آدمی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ خود افسانہ نگاری کے معاملہ میں وہ حد سے زیادہ جذباتی تھے۔ اگرچہ وہ سائنس کے طالب علم تھے لیکن کرشن چندر کے ناول پر ''مبادی حیاتیات'' کا ٹائیٹل چڑھایا کرتے تھے۔ ابراہیم شفیق اور اکرام جاوید یا تو افسانے سنانے میں مصروف رہتے تھے یا افسانے پڑھنے میں۔ ہم لوگ اکرام جاوید کو ''ظالم افسانہ نگار'' کہا کرتے تھے۔ وہ اس لیے کہ اکرام جاوید اپنے افسانوں کی ہیروئنوں کو یا تو ہمیشہ ہلاک کر دیتے تھے یا انہیں اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنا افسانہ ختم کر دیتے تھے۔ ظلم و ستم کے لحاظ سے ابراہیم شفیق دوسرے نمبر پر تھے۔ ذرا موقع ملتے ہی وہ اپنی ہیروین کا کام تمام کر دیتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے افسانہ لکھنا تو ایک بہانہ ہے۔ اصلی مقصد تو ہیروین کو ہلاک کرنا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی جب اپنا افسانہ سنانے کی خواہش ظاہر کرتا تو ہم لوگ پوچھتے ''پہلے یہ بتاؤ ہیروئن زندہ ہے یا مرگئی؟'' اگر جواب ملتا ''مرگئی ہے'' تو ہم کہتے ''کسی اور کو یہ افسانہ سناؤ۔ ہمیں تو زندہ ہیروئن چاہیے۔ مری ہوئی ہیروین کو لے کر ہم کیا کریں گے۔''

ایک بار اکرام جاوید کے ایک افسانہ کی ہیروین کسی نہ کسی طرح زندہ بچ کر نکل گئی۔ اکرام جاوید نے ہم لوگوں کو مژدہ سناتے ہوئے کہا ''آج زندہ ہیروین کا افسانہ سنو۔'' اس پر ہم لوگوں نے اس افسانہ کو اکرام جاوید کا افسانہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ حالت ہوگئی تھی کہ کسی کے بھی افسانہ میں ہیروین مرجاتی تو ہم ان دونوں سے پوچھتے ''بتاؤ! تم دونوں میں سے کس نے یہ حرکت کی ہے؟'' طالب علمی کے دن بھی کیا دن تھے۔ ایک ہوٹل میں اکرام جاوید، ابراہیم شفیق، تقی تنویر اور میں ہر شام کو بیٹھا کرتے تھے۔ اس ہوٹل میں ریڈیو سے فلمی ریکارڈ بڑے زور وشور سے بجا کرتے تھے لیکن اس زور وشور میں بھی اکرام جاوید اور ابراہیم شفیق افسانے سنایا کرتے تھے۔ دنیا کی

www.taemeernews.com

کوئی قوت انہیں افسانے سنانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ہوٹل کا مالک جان بوجھ کر ریڈیو کا والیوم بڑھا دیتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ دونوں اس قدر چیخ چیخ کر افسانے پڑھتے تھے کہ اکثر اوقات ہوٹل میں بیٹھے ہوئے گاہک، ہوٹل کے مالک کی طرف غصہ کی نگاہوں سے دیکھ کر کہتے ''ہم تو تم سے ریڈیو سے فلمی گانے سنوانے کی خواہش کر رہے ہیں اور تم ہمیں ریڈیو سے افسانے سنوا رہے ہو۔''

میں اور نقی تنویر چائے پی کر ہوٹل سے باہر نکل جاتے تھے لیکن یہ دونوں افسانے سنانے میں بدستور مصروف رہتے تھے۔ایک دن تو میں، نقی تنویر اور ابراہیم شفیق تینوں مل کر ہوٹل سے باہر آگئے لیکن اکرام جاوید ہوٹل میں بدستور اپنا افسانہ سناتے رہے۔آخر میں ایک نوبت وہ آگئی جب افسانہ سننے کے نام سے ہی وحشت ہونے لگی۔چنانچہ ایک رات میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک بے حد طویل افسانہ لکھا جو ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا۔دوسرے دن جب ابراہیم شفیق اور اکرام جاوید اپنے افسانے سنانے کے لیے میرے پاس پہنچے تو میں نے اپنا افسانہ ان لوگوں کے آگے بڑھا دیا اور کہا ''صفحات کو گنو''

ان لوگوں نے گن کر کہا ''۴۴ ہیں''

میں نے کہا ''اب تم لوگ اپنے اپنے افسانوں کے صفحات گنو۔''

گن کر بتایا ''چھ چھ صفحات ہیں۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔پہلے تم دونوں کو میرا افسانہ سننا پڑے گا۔''

یہ سنتے ہی اکرام جاوید اور ابراہیم شفیق کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔کہنے لگے ''ٹھیک ہے۔پھر کبھی سن لیں گے۔''

میں نے کہا ''تب تو ٹھیک ہے۔میں بھی پھر کبھی تمہارے افسانے سن لوں گا۔''

میرا وہ افسانہ جسے میں ہمیشہ ایک ہتھیار کی طرح اپنے ساتھ رکھتا تھا آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ابراہیم شفیق نے بہت اصرار کیا کہ میں اس افسانہ کو شائع کرادوں۔لیکن میں اپنے بچاؤ کے اتنے بڑے حربہ سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔پھر کالج کے دن ختم ہو گئے۔ساری رنگینیاں بکھر گئیں۔اور ہم اپنے خوابوں کو بیچ بیچ کر تلخ حقیقتیں

www.taemeernews.com

خریدنے پر مجبور ہو گئے۔ ابراہیم شفیق اور اکرام جاوید دونوں ہی محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گئے اور یہیں سے ابراہیم شفیق کی کہانیوں میں مجھے سنجیدگی نظر آنے لگی۔ بہت دنوں بعد ہم تینوں کی ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ''یار! تم دونوں نے محض اچھے اچھے ادبی رسالوں کو حاصل کرنے کے لیے غالباً محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کی ہے۔''

ابراہیم شفیق نے کہا ''تمہیں کیا معلوم کہ محکمہ ڈاک نے کتنے بڑے بڑے ادیبوں کو جنم دیا ہے۔ خود راجندر سنگھ بیدی کی مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔''

میں نے کہا ''اور آئین اسٹائین بھی تو محکمہ ڈاک ہی سے تعلق رکھتا تھا۔''

اس پر اکرام جاوید نے ہنستے ہوئے کہا ''آئین اسٹائین تو کجا دیوانند جیسا اداکار بھی محکمہ ڈاک سے وابستہ تھا۔''

اس دن ہم بڑی دیر تک اپنے ماضی کو یاد کرتے رہے۔ اس وقت خود ہمارا ماضی یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کسی اور کا ماضی ہو۔ ہمارے بہت سے خواب بک چکے تھے اور ہماری جھولیوں میں اس سودے کے عوض چند تلخ حقیقتیں جمع ہو گئی تھیں۔ کالج سے نکلنے کے بعد ابراہیم شفیق کے افسانے بڑی تیزی سے ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ میں انہیں پڑھ کر انجان بن جاتا مگر کبھی ابراہیم شفیق کا مذاق اڑانے کو جی نہ چاہا۔ اس لیے کہ ابراہیم شفیق کے اندر ایک بڑا مخلص اور بڑا شریف آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ اس شریف آدمی کی میں نے ہر طرح آزمائش کی ہے اور ہر آزمائش کے بعد یہ آدمی مجھے اور بھی شریف نظر آیا ہے۔ یوں بھی میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہر شریف آدمی افسانہ نگار بن جاتا ہے اور جو شریف نہیں ہوتا اس کے لیے تو شاعری اور مزاح نگاری کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ کالج کے زمانہ میں بھی ابراہیم شفیق کم گو تھے اور آج بھی کم گو ہیں۔ وہ صرف اپنے افسانوں میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

افسانہ کے باہر وہ صرف مسکراتے ہیں اور لگاتار مسکراتے ہیں۔ ابراہیم شفیق ان لوگوں میں سے ہیں جن سے دوستی کر کے آدمی صرف فائدہ اٹھا سکتا ہے کبھی نقصان نہیں اٹھا سکتا۔ زندگی کے اس سفر نے ابراہیم شفیق کو اور بھی سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ہم لوگ کالج کے

www.taemeernews.com

زمانے میں ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ سائنس کے طالب علم ہیں اور افسانے لکھتے ہیں۔ضرور یہ اپنے ہر افسانہ کو امتحانی نلی میں سے گذارتے ہوں گے یا اسے شکنجہ میں کس کر اس کا سائنسی تجزیہ کرتے ہوں گے۔

اس پر میرا دوست نقی تنویر کہتا "یار میرا تو خیال ہے کہ خود ابراہیم شفیق کو کسی شکنجہ میں کس دینا چاہیئے۔"

اور ابراہیم شفیق کو آج سچ مچ شکنجے میں کس دیا گیا ہے۔زندگی کے شکنجے میں......

......اور زندگی کے اسی شکنجے میں کس دیئے جانے کے بعد ابراہیم شفیق کو وہ شعور حاصل ہوا ہے جو افسانہ کی تخلیق کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

انہوں نے اپنے ایک افسانہ میں یہ جملہ لکھا ہے "میں خود اپنے اندر ایک صلیب سے لٹکا پھر رہا ہوں۔" ابراہیم شفیق کو اس صلیب کا ممنون ہونا چاہیئے جو ان کے اندر موجود ہے۔اسی صلیب نے انہیں درد، رچاؤ، نغمگی اور انسان دوستی کی اس منزل پر پہنچایا ہے جہاں وہ دوسروں کی صلیبوں کو بھی اٹھانے کے قابل بن سکے ہیں۔آج بھی ان کے افسانوں کی ہیروئنیں مرتی ہیں مگر مجھے ان کی موت پر ہنسی نہیں آتی۔آج ابراہیم شفیق صرف سطحی جذباتیت کے تحت اپنے افسانوں کی ہیروئینوں کو تفریحاً نہیں مارتا بلکہ وہ عقل اور منطق کی بنیادوں پر انہیں ضرورتاً ہلاک کرتا ہے۔پرانا ابراہیم شفیق اپنے افسانہ کی ہیروئین کو مار کر بالکل بے تعلق ہو جاتا تھا مگر آج کا ابراہیم شفیق اپنے افسانہ کی ہیروئین کے ساتھ خود بھی مرتا ہے۔نہ جانے کتنے افسانوں میں وہ کتنی بار مر چکا ہے اور نہ جانے کتنی بار اپنے ہر نئے کردار کے ساتھ زندہ ہوتا رہے گا۔

میں اپنے پرانے ساتھی ابراہیم شفیق کو ان کے افسانوں کے مجموعہ "ایک ہوا اور چلے" کی اشاعت پر مبارکباد دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہوا ابراہیم شفیق کو ادب میں بہت دور تک اڑا لے جائے گی۔

(1970)

☆☆

www.taemeernews.com

عوض سعید

میری ایک کمزوری یہ ہے کہ میں شرافت کے بارے میں تو بے تکان لکھ سکتا ہوں لیکن شریف آدمی کے بارے میں بالکل نہیں لکھ سکتا۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر مغنی تبسم نے دہلی فون کر کے جب مجھے اطلاع دی کہ عوض سعید کے افسانوں کے مجموعے کی رسم اجرا ہونے والی ہے تو میں نے مسرّت کا اظہار کیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بھی اس موقع پر کچھ کہنا ہے تو میں نے معذرت کا اظہار کیا۔ مغنی تبسم نے حیدرآباد کے موجودہ ادبی ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد میں اب لکھنے والوں کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ اسی لیے لکھنے والوں کو باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔

میں نے کہا "عوض سعید جیسے شخص پر لکھنے والوں کی کمی تو ہر دور میں رہے گی۔ اس کوتاہی کا تعلق حیدرآباد کے ادبی ماحول سے نہیں بلکہ خود عوض سعید کی ذات سے ہے۔"

بھلا بتائیے عوض سعید جیسے شریف، نیک اور پاک باطن آدمی کے بارے میں کوئی لکھے بھی تو کیا لکھے۔ میں تو خاک اسی شخص کا لکھتا ہوں جس میں تھوڑی سی اوباشی ہو، عیاری ہو، کچھ مکر ہو، کچھ فریب ہو، کچھ چھل ہو، کچھ کپٹ ہو۔ ہمارے دور کا آدمی ان ہی باتوں کی وجہ سے آدمی بنتا ہے۔ شرافت سے نہیں۔

عوض سعید سے میری ملاقات یا دوستی کم و بیش پینتیس برس پرانی ہے لیکن اس کے باوجود میری اور عوض سعید کی دوستی کبھی خود مکتفی نہ بن سکی۔ میری مراد یہ ہے کہ اس سے براہِ راست دوستی نہ ہوسکی۔ جب بھی اس سے ملا کسی نہ کسی حوالے یا وسیلے سے ہی ملا۔ عوض اکثر

www.taemeernews.com

شاذ تمکنت کے ساتھ پایا جاتا تھا اور میں جب جب شاذ سے ملنے جاتا تو عوض سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ایک آدمی شاہ علی بنڈہ جانے کا قصد کرے تو راستہ میں چار مینار تو پڑے گا ہی۔عوض سعید میرے لیے چار مینار ہی کی طرح ہے۔حیدرآباد میں برسوں رہنے کے باوجود آج تک میں چار مینار کے اندر نہ جا سکا اور نہ ہی اس کے اوپر۔اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تاریخی عمارت کیسے بنتی ہے اور شریف آدمی کیسے پیدا ہوتا ہے۔عوض سعید سے میری ملاقاتیں یا تو شاذ کے ہمراہ ہوئیں یا میرے اور عوض سعید کے مشترک دوست حفیظ قیصر کے ہمراہ۔

ایک زمانہ تھا جب مرحوم اورینٹ ہوٹل میں شاذ اور عوض ایک دوسرے کے سائے کی طرح ساتھ رہتے تھے۔دونوں کے ہاتھوں میں دو دو تین تین کلوگرام وزنی رسالے ہوتے تھے۔ان موٹے موٹے رسالوں کو ہر دم ساتھ اٹھائے پھرنے کا تعلق بظاہر علم سے کم اور جسمانی ورزش سے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ دونوں ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود تنہا بھی دکھائی دیتے تھے۔اورینٹ ہوٹل میں اکثر یہ الگ تھلگ بیٹھے رہتے تھے۔ان میں کیا تبادلۂ خیال ہوتا تھا اس کا بھی پتہ نہیں چلتا تھا۔خیال ہوتو تبادلہ بھی ہو۔جب شاذ سے میری دوستی بڑھنے لگی تو ظاہر ہے کہ عوض سعید سے بھی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔جب شاذ سے میری بے تکلفی بڑھی اور فقرہ بازی کی راہ نکل آئی تو دیکھا کہ عوض سعید کے پاس حس مزاح بھی ہے۔ہم دونوں میں جب نوک جھونک چلتی تھی تو عوض سعید کا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا تھا۔کبھی کبھی عوض سعید مجھ سے کہتا "یار تم بعض اوقات نوچ کر دیتے ہو" اور میں کہتا "عوض میں تو تھری پچ کرنا چاہتا ہوں اور تم نوچ کو ہی ہضم نہیں کر سکتے" نہ جانے کیوں مجھے عوض سعید کی ہنسی اچھی لگتی تھی۔اس لیے میں جان بوجھ کر ایسی باتیں کرنے کی کوشش کرتا تھا جس سے عوض سعید ہنستا ہی چلا جائے۔عوض سعید کو ہنسنے کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا کہ مجھے اسے ہنستے ہوئے دیکھنے کا شوق تھا۔عوض کی ہنسی میں ایک ایسی روانی اور سلاست ہے کہ اس کی ہنسی ایک اسلوب کی طرح نظر آتی ہے۔میں کبھی شاذ سے کہتا "یار عوض کی ہنسی میں جو روانی اور سلاست ہے اگر وہ اس کی کہانیوں میں بھی آجائے تو کیا کہنے۔" کبھی عوض سے کہتا "یار! یہ کیا تم شاذ کے سیٹیلائیٹ بنے پھرتے ہو۔شاعری کو

www.taemeernews.com

میں مفت خوری سمجھتا ہوں۔ چار پانچ غزلیں کہہ لیں اور مشاعروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اصل اہمیت تو نثر نگاری کی ہے۔ شاذ تمہاری طرح نثر لکھ کے دکھادے تو مانوں۔" میری پوری کوشش یہ ہوتی کہ عوض اور شاذ میں کسی نہ کسی عنوان کبھی نہ کبھی کوئی جھگڑا ضرور رہو۔ مگر ان دونوں میں دوستی کا ایک اٹوٹ معاہدہ تھا۔ نہ شاذ نے کبھی نثر لکھی اور نہ ہی عوض نے کبھی شعر کہے۔ مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو تو دوستی کی جڑیں اسی طرح مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ آج ہمارے اندر جلنے والے شعلوں کی لوئیں دھیمی ہو چکی ہیں مگر پچیس تیس برس پہلے کوئی بات ایسی نہ تھی، کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس کی طرف ہم نہ لپکتے ہوں۔ میں اپنے پرانے دوستوں کو اب بے بس، مضمحل، بدحال اور پژمردہ پاتا ہوں تو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ وقت کے چاک پر آدمی بالآخر، اسی طرح کا کھلونا بن جاتا ہے۔

بارِ الم اٹھایا رنگِ نشاط دیکھے
آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے

عوض سعید کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سائے کا سفر" چھپ کر آیا تو دوستوں میں اس پر طرح طرح کے تبصرے ہوئے۔ کسی نے کہا یہ شاذ کے سائے کا سفر ہے۔ کسی نے کہا یہ سائے کے سائے کا سفر ہے۔ عوض نے بڑے پیار سے اپنی پہلی کتاب مجھے دی تھی۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں لیکن اب اردو میں کتابیں ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہیں۔ اس وقت تک عوض سعید افسانہ نگار کی حیثیت سے سارے برصغیر میں جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کتاب میں تزئین کے نام پر ایک افسانے کی کتابت کچھ اس طرح کرائی گئی تھی کہ آدمی کو کئی پوز بدل کر اس افسانے کو پڑھنا پڑتا تھا۔ اس افسانے کو پڑھنے میں ذہنی ورزش کم اور جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار میں نے عوض سے کہا تھا، اگر کوئی آدمی اس افسانہ کو صبح میں روزانہ پانچ مرتبہ پڑھے تو اس سے اس کی صحت کبھی خراب نہیں ہوگی۔ صحت مند ادب کی اس سے بہتر کوئی اور مثال نہیں ہو سکتی۔ عوض نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ میرے تبصروں کو داد کے طور پر قبول کیا تھا اور وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ مستقبل میں بھی اسی طرح کے صحت مند افسانے لکھتا رہے گا۔

www.taemeernews.com

عوض کم گو، کم آمیز شخص ہے لیکن کسی سے دوستی کرتا ہے تو اسے نبھانا بھی جانتا ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اپنے ابتدائی افسانوں میں اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ قاری کو چونکایا جائے۔ چار پانچ سال پہلے اس کا ایک افسانہ پڑھ کر میں سچ مچ چونک گیا تھا کیونکہ اس میں اس نے قاری کو بالکل نہیں چونکایا تھا۔ اس چونکنے پر مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ کوئی بیس برس پہلے حفیظ قیصر نے ایک دن مجھے فون کر کے کہا "فوراً چلے آؤ مجھے عوض سعید کی ایک کہانی پڑھنی ہے۔ ذرا میری مدد کرو۔" میں نے کہا "جو چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اسے کیوں پڑھتے ہو۔ ویسے عوض تمہارے محلے میں ہی رہتے ہیں ان ہی سے کہانی بھی سمجھ لو۔"

حفیظ قیصر نے کہا "یار عوض کی کہانی خود عوض کی سمجھ میں کہاں آتی ہے؟ میں تو ایک اور سلسلے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسی مدد؟"

بولا "میں کہانی پڑھتا رہوں گا۔ تم مجھے مضبوطی سے پکڑے رہو تاکہ میں کہیں چونک نہ جاؤں۔ یار یہ عوض چونکاتا بہت ہے۔ اکیلا اور نہتا آدمی تو اس کی کہانی پڑھ ہی نہیں سکتا۔" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مغنی تبسم کے زیر اثر عوض نے قارئین کو چونکانے کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو عوض اب کہانیوں کو کہانی کی طرح لکھنے لگا ہے۔

جب سے میں دہلی گیا ہوں عوض سے سال میں دو ایک مرتبہ ہی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اکثر شکایت کرتا ہے کہ "یار تم حیدرآباد آتے ہو اور دوستوں سے ملے بغیر چلے جاتے ہو۔"

میں کہتا ہوں "عوض! ادب سے قریب رہنے کے لیے میں اب ادیبوں سے دور رہنے کو ضروری سمجھنے لگا ہوں۔" پچھلے دو تین برس سے عوض کا تقاضہ ہے کہ میں صرف اس کے لیے تین چار گھنٹوں کا وقت نکالوں تاکہ وہ مجھ سے بات چیت کرے اور میرا خاکہ لکھ سکے۔

میں کہتا ہوں "یار! خاکہ ایسی چیز نہیں ہے کہ تم جس کا خاکہ لکھ رہے ہو اس سے بات چیت بھی کرو۔ خاکہ نگاری سے میرا بھی جائز یا ناجائز سا تعلق ہے۔ جس کا خاکہ لکھتا

www.taemeernews.com

ہوں اس سے خاکہ لکھنے سے پہلے بات چیت نہیں کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ خاکہ لکھنے کے بعد اس سے بات چیت خود بخود بند ہو جاتی ہے۔"

عوض کہتا ہے "نہیں یار! خاکہ Authentic ہونا چاہیے۔"

میرا جواب ہوتا ہے "اور اگر تم جس کا خاکہ لکھ رہے ہو وہ آدمی ہی Authentic نہ ہو تو"؟

عوض جھنجھلا کر کہتا ہے۔ "تم فضول بحث کرنے لگ جاتے ہو۔ تم میں اب تک سنجیدگی اور بُردباری نہیں آسکی۔"

عوض سعید کے خاکے میں نے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے ہیں۔ عوض سعید کے اکثر خاکے میں نے بہت پہلے پڑھے تھے بلکہ میں نے ان خاکوں کو اس وقت پڑھا تھا جب عوض نے انہیں لکھا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ عوض نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں ان سے میرے بھی مراسم رہے ہیں بلکہ پانچ تو ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کے خاکے میں نے بھی لکھے ہیں۔ اب عوض کے لکھے ہوئے خاکوں کا اپنے لکھے ہوئے خاکوں سے تقابل کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ عوض سچ مچ Authentic خاکے لکھتا ہے۔ اس کے تین خاکے جو وحید اختر، عالم خوندمیری اور اوم پرکاش نرمل سے متعلق ہیں وہ بے حد اچھے اور Authentic ہیں۔ عوض نے جس راست گوئی کے ساتھ یہ خاکے لکھے ہیں اس پر رشک آتا ہے۔ عوض کے خاکے پڑھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ ایک ہی شخص کے بارے میں دو خاکہ نگاروں کا رویّہ کتنا مختلف ہوتا ہے۔ عوض سعید نے شہریار کے خاکے میں لکھا ہے کہ "شہریار یاروں کا یار ہے اور دشمنوں کے لیے اُبلی ہوئی تلوار بھی۔ وہ آپ کو تباہی کے آخری دہانے پر پہنچا کر خدا حافظ بھی کہہ سکتا ہے، اور آپ کو سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھ کر چھلانگ بھی لگا سکتا ہے" شہریار کے بارے میں عوض سعید کی یہ رائے میرے لیے سچ مچ ایک انکشاف سے کم نہیں۔ میں نے بھی شہریار کا ایک خاکہ لکھا ہے مگر شہریار کی شخصیت کے اس گوشے کی طرف میری نظر نہیں گئی۔ شہریار میرا ابھی قریبی دوست ہے۔ اگرچہ وہ علی گڑھ میں رہتا ہے لیکن ہم دونوں ہر مہینے ملنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یا تو میں علی گڑھ چلا جاتا ہوں یا شہریار

www.taemeernews.com

دہلی آجاتا ہے۔ پندرہ بیس برس سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اتنی رفاقت کے باوجود مجھے شہریار کی شخصیت میں کوئی پوشیدہ اُبی ہوئی تلوار نظر نہ آسکی۔ وہ تو بے حد مرنجان مرنج، بے ضرر اور بے نیاز سا آدمی ہے۔ دو تین برس پہلے شہریار واشنگٹن سے دہلی واپس پہنچا تو میں نے کہا "یار شہریار! تمہاری وہ اُبی ہوئی تلوار کہاں ہے؟"

شہریار نے کہا "بھئی کیا بتاؤں۔ میں نے جس ایرلائنس میں سفر کیا تھا اس نے بڑی گڑ بڑ کر دی۔ میرا سامان کسی اور جہاز میں سوار کروادیا اور مجھے کسی اور جہاز میں بٹھادیا۔ میرا سامان تو میرے ساتھ آیا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "تو کیا تم نے واشنگٹن میں کوئی تلوار بھی خریدی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کسٹم والوں کے ہاتھوں تمہاری خیریت نہیں ہوگی۔" شہریار نے کہا "میں تو اپنے سارے سامان کو رو رہا ہوں اور تم نے تلوار کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میرا تلوار سے کیا تعلق؟ میں تو طاؤس ورباب اوّل، شمشیر وسناں آخر کا قائل ہوں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے عوض سعید کے خاکے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ اتنی دوستی اور رفاقت کے باوجود تم نے اپنی تلوار عوض سعید کو تو دکھادی لیکن مجھے نہیں دکھائی۔"

شہریار نے ہنس کر کہا "جس کو جو چیز دکھانی ہوتی ہے وہی اس کو دکھاتا ہوں۔"

میں نے شہریار سے کہہ رکھا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو میں تمہاری تلوار دیکھ کے رہوں گا اور شہریار نے بھی وعدہ کیا ہے کہ واشنگٹن سے جب اس کا سامان آجائے گا تو تلوار دکھادے گا۔ عوض سعید سے مجھے صرف ایک شکایت یہ ہے کہ اس نے شاذ تمکنت کا کوئی خاکہ نہیں لکھا۔ میں نے ایک صاحب سے اس کمی کا ذکر کیا تو بولے "بھئی! عوض نے شاذ کا خاکہ اس لئے نہیں لکھا کہ وہ شاذ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔"

(1991)

☆☆

www.taemeernews.com

ف۔س۔اعجاز

(کلکتہ میں ''موسم بدل رہا ہے'' کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

''موسم بدل رہا ہے۔'' کی اشاعت پر میں اپنے دوست ف۔س۔اعجاز کو مبارک باد تو دوں گا ہی لیکن اس سے پہلے میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے ان کا دلی شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہ یہ کتاب شائع نہ کرتے تو میرے کلکتہ آنے کی سبیل کیوں کر نکل سکتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اردو کا ادیب اور شاعر ذرا سی بھی شہرت پالے تو اپنے پلّے سے کرایہ ادا کر کے سفر کرنے کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔ اس کے پاس ذوقِ سفر تو اس کا اپنا ہوتا ہے لیکن سفر کے دیگر لوازمات حتیٰ کہ سامان سفر تک دوسروں کا ہوتا ہے۔ پھر آدمی کو اعزازی زندگی گزارنے کی لت پڑ جائے تو معاملہ کچھ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ ہمیں اردو کے ایک شاعر کی یاد آ گئی جنہوں نے اپنی حقیقی بھتیجی کی شادی میں شرکت کی تو نہ صرف آنے جانے کا کرایہ وصول کیا بلکہ اس مبارک و مسعود موقع پر سہرا پڑھنے کا اتنا ہی معاوضہ لیا جتنا کہ وہ عام شادیوں میں لیا کرتے ہیں۔

کلکتہ میں تین مرتبہ آ چکا ہوں لیکن اسے دیکھنے کا شرف پہلی مرتبہ حاصل کر رہا ہوں۔ ایک بار ٹوکیو جاتے ہوئے پلین میں بیٹھے بیٹھے اس کا دیدار کیا تھا۔ لیکن یہ دیدار بھی کوئی دیدار رہا۔ دوسری مرتبہ کچھ یوں ہوا کہ مجھے پٹنہ سے حیدرآباد جانا تھا۔ دوستوں نے کہا کہ پٹنہ سے حیدرآباد جانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ پہلے کلکتہ چلے جاؤ۔ وہاں چار پانچ گھنٹے رکو اور ایسٹ کوسٹ ایکسپریس پکڑ کر حیدرآباد چلے جاؤ۔ میں نے سوچا تھا کہ چار پانچ گھنٹوں میں جتنا کلکتہ بھی دکھائی دے جائے اسے دیکھ لوں۔ سو میں نے محترم ایس۔ ملیح آبادی

www.taemeernews.com

اور ظ۔اوگانوی صاحب کو خطوط لکھے کہ میں کلکتہ آرہا ہوں۔(میں یہ صراحت بھی کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایس۔ملیح آبادی اور ظ۔اوگانوی سے یہاں میری مراد احمد سعید ملیح آبادی اور ظفر اوگانوی سے ہے۔جب سے ماہنامہ "انشا" کے مدیر ف۔س۔اعجاز سے میری ملاقات اور "انشا" کے نائب مدیر جی۔ایم۔جگنو سے میری خط و کتابت کا آغاز ہوا ہے میں اکثر ناموں کے ساتھ نہ جانے کیوں ایسا سلوک کرنے لگا ہوں۔حد ہوگئی کہ لفافوں پر پتہ لکھتے ہوئے کانپور کوک۔پور اور مینا کشی پورم کوم۔ک۔پورم لکھنے لگا ہوں) خیر! اس مسئلہ پر الگ سے روشنی ڈالوں گا۔فی الحال تو اپنے دوسرے سفر کلکتہ کا ذکر کروں گا۔اکتوبر ۱۹۸۵ء کی ایک صبح کو ہوڑہ اسٹیشن پر پہنچا۔بہت دیر تک پلیٹ فارم پر قبلہ ایس۔ملیح آبادی صاحب اور ظ۔اوگانوی صاحب کو ڈھونڈتا رہا۔وہ نظر نہیں آئے تو پچاس پیسے کے چھ سکّے یکے بعد دیگرے ہوڑہ اسٹیشن کے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ میں ڈالے۔ہمیشہ غلط نمبر سے میرا سابقہ پڑا۔بلکہ ایک رانگ نمبر والے نے تو شاید بنگلہ زبان میں گالیاں تک دیں۔وہ تو اچھا ہوا کہ میں بنگالی نہیں جانتا اسی لیے بے مزہ نہیں ہوا تھک ہار کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ نہ صرف کلکتہ کے ٹیلی فون دہلی کے ٹیلی فونوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ یہاں کے باسی بھی دہلی کے باسیوں سے کم نہیں ہیں۔سامان کو حفاظت گھر میں رکھ کر ہوڑہ اسٹیشن کے باہر آیا۔سوچا کہ کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہی کلکتہ کے درشن کروں گا مگر معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو میری آمد کی اطلاع پہلے سے مل چکی ہے (حالانکہ میں نے انہیں کوئی خط نہیں لکھا تھا)۔سو اس دن انہوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔چار و ناچار زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسے رکشا میں بیٹھا جسے ایک آدمی کھینچ رہا تھا۔ہوڑہ کے پل کے دو چار پھیرے لگائے۔پھر ہُگلی کے کنارے بیٹھ کر دریا میں کنکریاں پھینکنے کا جو سلسلہ شروع کیا تو دو چار گھنٹے اسی میں نکال دیئے۔پچاس پیسے کا ایک اور سکّہ جو ٹیلی فون بوتھ میں ضائع ہونے سے بچ رہا تھا اسے بھی ہگلی کی نذر کیا کہ یہاں کسی رانگ نمبر کے ملنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔پھر ایک تمنا یہ بھی تھی کہ لاکھوں انسانوں سے آباد اس شہر کو اپنی بھی کوئی نشانی دیتے جاؤ۔چنانچہ ہگلی میں میرے پچاس پیسے اب تک پڑے ہوئے ہیں۔ویسے یہ کوئی نئی بات

www.taemeernews.com

نہیں ہے میں نے تو لندن کی ٹیمز، پیرس کی سین، نیویارک کی ہڈسن، ماسکو کی مسکاوا، لینن گراڈ کی نیواندی میں بھی اپنا سرمایہ اسی طرح مشغول کر رکھا ہے۔غریب آدمی کے پاس جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو وہ اپنی محنت کی ارزانی اور جذبوں کی فراوانی کو اسی طرح غرق آب کرتا ہے۔اسی لیے تو کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔چار پانچ گھنٹوں بعد جب میں ہوڑہ سے روانہ ہوا تو غالب کے شعر کا مطلب اس کے پورے تناظر کے ساتھ سمجھ میں آ گیا کہ کلکتہ کے ذکر کے ساتھ غالب کا سینہ تیروں سے کیوں چھلنی ہو جاتا تھا۔گاڑی جب فراٹے بھر رہی تھی تو ایک ریلوے کراسنگ کے پاس مجھے ایک موڑ میں ایک صاحب نظر آ گئے جو احمد سعید ملیح آبادی صاحب سے بہت مشابہ تھے۔میں نے فوراً اپنا ہاتھ ہلایا۔ان صاحب نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔پتہ نہیں وہ صاحب احمد سعید ملیح آبادی تھے بھی یا نہیں۔میں نے بعد میں ان سے تصدیق بھی نہیں چاہی۔مجھے تو اس وقت احمد سعید ملیح آبادی کی نہیں بلکہ ایک ایسے ہاتھ کی حاجت تھی جو کلکتہ سے مجھے وداع کرنے کے لیے ہوا میں لہرائے۔تو یہ تھی روداد میرے دوسرے سفر کلکتہ کی۔

اب میرے تیسرے مگر اصل میں پہلے سفر کلکتہ کی داستان کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ دہلی میں اردو کے ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقاریب کے دوران میں ایک نوجوان سے اچانک ملاقات ہو گئی۔

بولے۔"میں ف۔س۔اعجاز ہوں۔کلکتہ سے اردو کا ایک رسالہ 'انشاء' نکالتا ہوں۔"

یوں رسالہ اور رسالے کے مدیر دونوں کا پہلی بار دیدار نصیب ہوا۔ف۔س۔اعجاز کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا۔البتہ "انشاء" کا نام پہلی بار سنا تھا۔میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے۔انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

"اعجاز تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ ف اور س کیا ہے؟"

میں نے کہا"ف سے فارسی اور س سے سنسکرت۔یہ غالباً اپنی شاعری میں ان دونوں زبانوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔"

میرے دوست نے کہا"یار! نام ن۔م۔راشد سے ہی پریشان تھے۔اب ایک

www.taemeernews.com

ف۔س۔اعجاز بھی آ گئے۔'' میں نے کہا ''تم یقین کرو۔ن۔م۔راشد کی وجہ سے میں اردو کے حروف تہجی کی ترتیب بھول چکا ہوں۔''م'' کا حرف ہمیشہ''ن'' سے پہلے آتا ہے لیکن محض ن۔م۔راشد کی مقبولیت کی وجہ سے میں نے''ن'' کو ہمیشہ''م'' سے پہلے رکھا۔مجھے اندیشہ ہے کہ اب''ف'' کے بعد''ق'' نہیں''س'' کا حرف آیا کرے گا۔''

کانفرنس کے اجلاسوں میں وہ جب بھی نظر آئے اپنا رسالہ کسی نہ کسی کو دیتے ہوئے نظر آئے۔کانفرنس کے ایک ڈنر میں کھانے پر چھینا جھپٹی کے دوران میں آمنا سامنا ہوا تو مجھ سے پوچھا۔

''آپ کبھی کلکتہ آئے ہیں؟''

میں نے کہا''دو مرتبہ آ چکا ہوں۔''

پوچھا''قیام وطعام کہاں تھا؟''

میں نے کہا''پہلی مرتبہ تو قیام وطعام ہوائی جہاز ہی میں رہا۔دوسری مرتبہ ہوڑہ کے پُل پر قیام رہا۔طعام کی نوبت البتہ نہیں آئی۔''

میں نے سفر کی تفصیل سنائی تو بولے''آپ کو کلکتہ آنا چاہیے۔''

میں نے کہا اب کلکتہ آنے کی حاجت نہیں رہی کیونکہ دہلی میں ش۔زماں یعنی شمس الزماں سے تقریباً روز کا ملنا جلنا ہے۔کلکتہ کی وہ ساری ہستیاں جو کلکتہ میں ہم جیسوں سے منہ چھپاتی پھرتی ہیں وہ دہلی میں شمس الزماں کے کمرہ پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔کلکتہ شہر کا حال چال بھی ان سے معلوم ہو جاتا ہے۔خاصا اچھا شہر ہے۔جہاں بھی رہے آباد رہے۔ احمد سعید ملیح آبادی اپنا'آزاد ہند'اور وسیم الحق اپنا'مشرق'مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔اب کلکتہ آ کر کیا کروں؟''

اس ابتدائی ملاقات کے بعد وہ کلکتہ واپس چلے گئے۔''انشاء'' میرے پاس پابندی سے آنے لگا۔ایک دن ان کا خط آیا کہ وہ''انشاء'' کا احمد سعید ملیح آبادی نمبر نکال رہے ہیں۔فوراً خاکہ روانہ کیجئے۔میں کاہل اور سُست آدمی ہوں اور اگر کسی ایسی شخصیت کا خاکہ لکھنے کا مرحلہ درپیش ہو جس کا میں بے حد احترام کرتا ہوں تو اور بھی سُست اور کاہل الوجود

www.taemeernews.com

بن جاتا ہوں۔ ابتداء میں اپنی خاموشی سے ان کے صبر کا امتحان لینا چاہا لیکن انہوں نے میری خاموشی کو اپنے جبر کے ذریعہ توڑنے کا نسخہ آزمایا۔ یعنی اب کی بار اپنے رفیق جی۔ ایم۔ جگنو کو مجھے یاددہانی کرانے کے کام پر مامور کردیا۔ اب جو جگنو صاحب کے خط آنے لگے اور ان کے تقاضوں کے تیور دیکھے تو احساس ہوا کہ یہ وہ جگنو نہیں جو صرف رات کو چمکتا ہے بلکہ یہ وہ جگنو ہے جو دن میں بھی چمکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خطوں سے بات نہیں بنی تو کلکتہ سے ٹرنک کالوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بالآخر میں نے جگنو کو نہیں بلکہ جگنو نے مجھے پکڑ لیا۔ جیسے تیسے میں نے احمد سعید ملیح آبادی کا خاکہ لکھا اور اب تک شرمندہ ہوں کہ ان کا جس طرح کا خاکہ مجھے لکھنا چاہیے تھا وہ میں نہیں لکھ سکا۔ اس خاکہ میں ان کی شخصیت اس طرح روشن نہیں ہوسکی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔ یوں سمجھئے کہ جگنو کی چمک میں آپ انہیں جتنا دیکھ سکتے ہیں اتنا ہی دکھا پایا۔ مگر ایک بات مجھ پر یہ واضح ہوگئی کہ ف۔س۔اعجاز دھن کے پکے آدمی ہیں۔ کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر کر کے رہتے ہیں۔ جس پابندی سے وہ ''انشاء'' نکال رہے ہیں اتنی پابندی سے تو کوئی عابد، عبادت بھی نہ کرتا ہوگا۔ میں نے ایک بار ان سے کہا ''انشاء'' سے مجھے یہ شکایت ہے کہ یہ اردو کا رسالہ نہیں لگتا۔''

بولے ''وہ کیسے؟''

میں نے کہا ''ہر مہینہ پابندی سے جو آجاتا ہے۔ بھیا! اردو کا رسالہ ہے اسے اتنی پابندی سے نہیں نکالا کرتے۔ آپ اردو قارئین کی عادت بگاڑ رہے ہیں۔ میں اردو کے ایسے کئی ماہناموں سے واقف ہوں جو سال میں ایک مرتبہ نہایت پابندی سے اپنا شمارہ شائع کرتے ہیں۔ آپ تو اپنے اداریوں میں مالی مشکلات کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ یہ تک نہیں بتاتے کہ آپ نے اردو کی بے لوث خدمت کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ رسالہ کا نکالنا اتنا ضروری نہیں ہوتا جتنا کہ اس کے مدیر کا سر سے کفن باندھنا۔ اسی لیے تو اردو صحافت میں اب سر کم اور کفن زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ اردو کے بعض رسالوں میں چھپنے والے مواد کو دیکھ کر یہ یقین پختہ ہوجاتا ہے کہ ان کے مدیروں نے واقعی سر سے کفن باندھ لئے ہیں۔ اگر سر سے کفن بندھا نہ ہوتا تو انہیں یہ پتہ تو چل جاتا کہ وہ اپنے رسالے میں کیا

www.taemeernews.com

چھاپ رہے ہیں۔اردو کی خدمت کرنے کا یہ جانبازانہ اور سرفروشانہ طریقہ اتنا مقبول ہوگیا ہے کہ اب رسالہ نکالنے کا خواہشمند پہلے اخبار کا ڈیکلریشن نہیں لیتا بلکہ بازار سے پہلے ایک کفن لے آتا ہے۔''

میری اس بات پر وہ یوں شرما کر رہ گئے جیسے انہیں اپنی اس کوتاہی کا شدت سے احساس ہورہا ہو۔ایک بار ''انشاء'' میں میرا ایک مضمون چھپا۔اس کے ردِعمل کے طور پر میرے پاس ایسے ایسے مقامات سے قارئین کے خطوط آئے جہاں ''انشاء'' کے پہنچنے پر تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی مگر ملک کے ٹرانسپورٹ سسٹم کی ترقی نے مجھے ضرور حیرت زدہ کردیا کہ یا خدا ان مقامات پر بھی اب بسیں اور ٹرینیں جانے لگی ہیں۔''انشاء'' بھی تو آخر ٹرینوں اور بسوں میں ہی جاتا ہوگا۔سبحان اللہ کیا ترقی کی ہے اپنے ملک نے بھی۔

ابتداء میں ''انشاء'' کا مزاج بنا نہیں تھا مگر اب رفتہ رفتہ بنتا جارہا ہے۔بس ایک شکایت مجھے یہ ہے کہ رسالہ کے سرورق پر اکثر اوقات کسی یورپی حسینہ کی یا یورپ کے کسی منظر کی تصویر چھاپ دی جاتی ہے۔مثال کے طور پر ''انشاء'' کا تازہ شمارہ بہار کے عصری ادب کے لیے مخصوص ہے اور اس کے سرورق پر انگرڈ برگمن کی تصویر چھاپ دی گئی ہے۔ انگرڈ برگمن جیسی عظیم اداکارہ کی صلاحیتوں سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے مگر اس کی اداکاری سے بہار کے عصری اردو ادب کا کیا رشتہ ہے۔یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔پرسوں کی بات ہے اردو کے ایک استاد نے جو مخطوطات اور متقدمین کے کلام میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، اس تصویر کے بارے میں جب مجھ سے دریافت کیا تو میں نے یوں ہی ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ بہار کی ایک خاتون افسانہ نگار کی تصویر ہے۔اب یہ روز مجھ سے اس خاتون افسانہ نگار کا نام اور پتہ پوچھنے کے لیے آجاتے ہیں۔رازدارانہ انداز میں یہ تک پوچھ چکے ہیں کہ موصوفہ کی شادی ہوچکی ہے یا نہیں۔گویا اب مخطوطات میں ان کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔اب کوئی مجھے بتلائے کہ میں انہیں کیا بتلاؤں۔

''انشاء'' کا ذکر شاید یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ''انشاء'' ف۔س۔اعجاز کے وجود اور ان کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔

www.taemeernews.com

اسے ف۔س۔اعجاز کی محبت نہ کہوں تو اور کیا کہوں کہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو مجھے ضرور یاد کرتے ہیں۔ایک بار آئے تو اپنی نظموں کا مجموعہ ''مالکِ یوم الدین'' مجھے دے گئے۔جاتے جاتے کہنے لگے اگلا شعری مجموعہ بھی جلد ہی آنے والا ہے۔میں نے دل ہی دل میں سوچا اگلے مجموعہ کا نام بلاشبہ ''ایاك نعبد و ایاك نستعین'' ہوگا۔وہ سچ مچ کمال کے آدمی ہیں۔جو بات بھی کرتے ہیں اس میں ندرت اور جدّت کی گنجائش ضرور نکالتے ہیں۔

ڈیڑھ دو مہینہ پہلے دہلی آئے تو بولے'' آپ کو کلکتہ آنا ہے۔''

میں نے کہا'' اب آ کر کیا کروں گا۔جتنی کنکریاں ہگلی میں پھینک سکتا تھا وہ میں نے پھینک دی ہیں۔''

بولے'' آپ کو میرے شعری مجموعہ کی رسم اجراء انجام دینی ہے۔''

میں نے کہا'' میں اور شعری مجموعہ کی رسم اجراء ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔میں ٹھہرا مزاح نگار اور آپ ٹھہرے شاعر۔یوں بھی دوسرے درجہ کا اَدب لکھنے والا پہلے درجہ کا اَدب لکھنے والے کی کتاب کی رسمِ اجراء کیوں کر انجام دے سکتا ہے۔یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ موٹر ڈرائیور سے یہ کہیں کہ وہ حکومت بھی چلائے۔''

مگر ف۔س۔اعجاز اپنی ضد پر اڑے رہے اور آج میں پوری ندامت کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔سخن فہمی کے معاملہ میں میرا یہ وتیرہ رہا ہے کہ جب بھی کوئی شعر میری سمجھ میں نہیں آتا تو بے تحاشہ داد دیتا ہوں تاکہ اپنا اور شاعر دونوں کا بھرم قائم رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی بیشتر اردو شاعری کے تعلق سے میرا یہی رویہ رہا ہے۔اب جو ف۔س۔ اعجاز کی شاعری پڑھی تو مجھے ان کے کلام پر داد دینے کے معاملے میں نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ یہ ایسی شاعری ہے جو نہ صرف میری سمجھ میں آرہی ہے بلکہ دل کو چھو رہی ہے، احساس کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے، ذہن کے نہاں خانہ میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔شعر پڑھتے ہوئے اپنی ذات میں یہ سب کچھ ہونا ایک عرصے سے بند ہو چکا تھا۔اب یہ ہونے لگا ہے تو زبان سے داد کا ادا ہونا دشوار سا لگ رہا ہے۔میں تو شعر پر اسی

www.taemeernews.com

صورت میں بے ساختہ داد دینے کا عادی ہو چکا ہوں، جب یہ میری سمجھ میں نہ آئے ۔ بھائی بیس پچیس برسوں کی عادت ہے ۔ یونہی تھوڑا جائے گی ۔ ف ۔س۔ اعجاز کی شاعری ایسی نہیں ہے کہ آپ صرف شاعر کو داد دے کر ادب کا حساب بے باق کر دیں ۔ یہ داد تو وہ ہے جو پڑھنے والا اپنے آپ کو چپکے چپکے دیتا ہے ۔ ایسی داد کے لیے کسی بیجا شور وغل کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اسی لیے میں فی الحال ف ۔س۔ اعجاز کو ان کی شاعری پر داد نہیں دوں گا کیونکہ اس شاعری کی داد، ایک قاری کی حیثیت سے پہلے میں اپنے آپ کو دینا چاہتا ہوں ۔

میں ف ۔س۔ اعجاز کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام کے پیش لفظ کا عنوان ہی رکھا ہے ۔ ''کچھ اپنے قارئین سے ۔'' گویا اب ادب میں بے چارے قاری کی اہمیت کو بھی محسوس کیا جانے لگا ہے ۔ عرصہ ہوا کہ ہمارے سنجیدہ ادب کا معتبر اور ذہین قاری غائب ہو چکا ہے ۔ پہلے شاعر اور قاری مل کر ادب کے بارے میں فیصلے کیا کرتے تھے مگر اب شاعر اور نقاد مل کر آپس میں ریوڑیاں بانٹ رہے ہیں ۔ مجھے خوشی ہے کہ ف ۔س۔ اعجاز نے اپنی شاعری کے ذریعہ قاری اور فنکار کے رشتہ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے ۔ اور یہ کوشش اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب کا موسم سچ مچ بدل رہا ہے ۔ یہ محکمہ موسمیات کی رسمی پیشین گوئی نہیں جو بعد میں حسب معمول جھوٹی ثابت ہو بلکہ یہ ایک نوجوان، توانا، باشعور اور باصلاحیت شاعر کے دل کی دھڑکنوں سے تشکیل پانے والی پیشین گوئی ہے جو کبھی جھوٹی ثابت نہیں ہوگی ۔ میں روزنامہ ''عکاس'' کے مدیر کریم رضا مونگیری اور افضل اقبال کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے کلکتہ آنے کی دعوت دے کر ان شخصیتوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا جنہیں میں عرصہ سے غائبانہ طور پر جانتا ہوں اور جن سے ملنے کی تمنا ہمیشہ میرے دل میں جوان رہی ہے ۔ قبلہ سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، اعزاز افضل، عین رشید، قیصر شمیم، احسن مفتاحی، جشش خواجہ یوسف اور بعض دیگر اہل قلم وہ شخصیتیں ہیں جنہوں نے ہر موسم میں اردو شعر و ادب کی شمع جلائے رکھی ہے اور اب جب کہ موسم بدل رہا ہے مجھے یقین ہے کہ اس شمع کی لو کچھ اور بھی تیز ہوگی ۔ آخر میں ف ۔س۔ اعجاز کی ایک غزل کے چند شعر سنا کر اپنی بات کو ختم کرتا

www.taemeernews.com

چاہوں گا ۔

آدھی ادھوری بات کی لرزش
ہونٹوں پر جذبات کی لرزش
آج بھی شانے پر ہوتی ہے
اک انجانے ہات کی لرزش
کتنے موتی رکھ پائے گی
آنکھوں میں صدمات کی لرزش
تخت الٹ دے، تاج بدل دے
کاغذ کے صفحات کی لرزش

(1988)

www.taemeernews.com

سیّدہ شانِ معراج

صاحبو! بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب مجھے شاہ جہاں پور کی سرزمین پر قدم رکھنا پڑا۔امریکہ کے خلا باز نیل آرام اسٹرانگ نے جب چاند کی سطح پر پہلا قدم رکھا تھا تو یہ انسانی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔میرا شاہ جہاں پور آنا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔لیکن بعض حالات کی وجہ سے میرے لیے یہ غیر معمولی سا واقعہ لگتا ہے۔میں دنیا کے کئی بڑے شہروں اور ہندوستان کے بے شمار شہروں میں جا چکا ہوں۔لیکن شاہ جہاں پور ہی وہ واحد شہر ہے، جہاں میں ہر بار آتے آتے یا جاتے جاتے رہ گیا۔میں یہاں آنے کی کوشش میں پچھلے پندرہ برسوں سے ناکام ہوتا آیا ہوں۔ایسا نہیں ہے کہ میں دہلی سے شاہ جہاں پور تک کا سفر کرنا نہیں جانتا۔میرے لیے اصل مسئلہ سفر کا نہیں بلکہ آداب سفر کا ہوتا ہے۔دہلی میں میرے دفتر کے ساتھی اور عزیز دوست رگھونندن سہائے سکسینہ، جو شاہ جہاں پور کے مشہور شاعر آنجہانی جگدیش سہائے سکسینہ کے فرزند بھی ہیں، پندرہ برسوں سے مجھے شاہ جہاں پور چلنے کی دعوت دیتے آئے ہیں۔ان کی دعوت کو قبول کرنے میں مجھے ہمیشہ یہ تامل رہا کہ جس شخص نے خود شاہ جہاں پور کو خیر باد کہہ کر دہلی میں اپنا گھر بسا لیا ہو، اسے یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ مجھے شاہ جہاں پور آنے کی دعوت دے۔

یہی حال میرے دو اور دوستوں پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر ناصر الدین خاں کا بھی رہا ہے کہ رہتے تو دہلی میں ہیں اور مجھے شاہ جہاں پور آنے کی نہیں بلکہ جانے کی دعوت دیتے ہیں۔میں کسی بھی شہر میں اس وقت تک مہمان بن کر نہیں جاتا جب تک مجھے مدعو کرنے والا میزبان اس شہر میں باضابطہ طور پر آباد نہ ہو۔اس سے مہمان کی ذات میں ایک عجیب سا

www.taemeernews.com

اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یوں بھی ہمارے مشرقی آداب میزبانی اور مہمان نوازی میں مہمان ہمیشہ میزبان پر غالب اور حاوی رہتا ہے۔ اہمیت میزبان کی نہیں، مہمان کی ہوتی ہے۔ چار پانچ برس پہلے رونق رضا صاحب اور ان کی شریکِ حیات سیّدہ شانِ معراج نے مجھے شاہ جہاں پور آنے کی دعوت دی تھی۔ میں نے یہ دعوت قبول تو کر لی لیکن مسئلہ پھر آداب سفر کا اٹھ کھڑا ہوا۔ بعد میں جب رونق رضا صاحب، جنہیں آج مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، مسلسل استفسار فرمانے لگے کہ میں شاہ جہاں پور کب آ رہا ہوں، تو میں نے عرض کیا ''حضور! آپ نے ہمارے شاہ جہاں پور آنے کی ایک شرط تو منظور کر لی ہے یعنی کرایہ آمدورفت آپ دیں گے اور قیام و طعام کا بندوبست بھی فرمائیں گے۔ لیکن ہمارے سفر کی دوسری شرط ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔'' پوچھا ''وہ کیا ہے؟'' عرض کیا ''شاہ جہاں پور میں کوئی ادبی ہنگامہ برپا کیجیے۔ جیسے ادبی محفل، سیمینار، مذاکرہ، مباحثہ، استقبالیہ، رسم اجرا اور کچھ نہیں تو مشاعرہ ہی سہی۔ ہم کسی شہر میں اس وقت تک نہیں جاتے جب تک 'توبہ چاہوں گا'، 'مکرر ارشاد'، 'عرض کیا ہے'، 'عطا ہو' وغیرہ جیسے جملوں کو سننے کے وافر مواقع میسر نہ ہوں۔ آپ شاہ جہاں پور کی بات کرتے ہیں۔ ہم تو لندن، نیویارک، پیرس، ماسکو اور ٹوکیو جیسے صنعتی شہروں میں بھی ان ہی چند جملوں کے دھاگے سے بندھے ہوئے چلے گئے تھے۔'' غرض پچھلے چار پانچ برسوں سے ہمیں شاہ جہاں پور بلانے کے لیے کسی ادبی ہنگامہ کے انعقاد کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ خدا بھلا کرے سیّدہ شان معراج کا کہ ہمیں بلانے کی خاطر انہیں اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا پڑا اور بفضل تعالیٰ آج ہم ان کے مجموعہ کلام کی رسم اجرا کے جلسہ میں بہ نفس نفیس موجود ہیں۔ ہمیں اس وقت ایک یونانی کہانی یاد آ رہی ہے کہ کسی نوجوان کو جنگل میں چلتے چلتے گھوڑے کی ایک نعل پڑی ہوئی مل گئی۔ نوجوان نے سوچا ایک نعل سے تو کوئی بات نہیں بنے گی۔ باقی تین نعلیں اور چاہئیں۔ جب اس کے پاس جیسے تیسے تین نعلیں اور جمع ہو گئیں تو اس نے سوچا کہ ان چار نعلوں کا کیا فائدہ جب تک اس کے پاس کوئی گھوڑا نہ ہو۔ نوجوان دھن کا پکا تھا۔ اس نے بالآخر ایک طاقتور اور پھرتیلا گھوڑا بھی حاصل کر لیا۔ جب وہ گھوڑے پر بیٹھ کر چلنے لگا تو اس نے سوچا کہ اس ایک گھوڑے سے

www.taemeernews.com

کیا ہوگا۔اس کے ساتھ کچھ اور گھڑ سوار بھی ہونے چاہئیں۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گھڑ سواروں کی ایک اچھی خاصی فوج بنالی اور چند دنوں بعد اس فوج کی مدد سے اپنے علاقہ کا بادشاہ بن گیا۔غور فرمائیے تو آج کے جلسہ میں ہماری حیثیت اس نعل کی سی ہے جو نوجوان کو جنگل میں پڑی ہوئی ملی تھی ۔بعد میں مخمور سعیدی، امیر قزلباش اور زبیر رضوی جیسی نعلیں بھی اس محفل کے گھوڑے کے پاؤں میں لگ گئیں۔اب تو قبلہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، سید شریف الحسن نقوی اور کے۔ایل۔نارنگ ساقی جیسے شہ سوار اور سپہ سالار بھی اس محفل میں شامل ہو گئے ہیں۔لیکن یہ اہمیت کیا کم ہے کہ ہم اولین نعل رہے ہیں۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں سیدہ شان معراج کی شان میں کچھ عرض کروں۔آپ سب جانتے ہیں کہ میں جو کچھ عرض کرتا ہوں اور جس طرح عرض کرتا ہوں اس کی نوعیت کیسی ہوتی ہے۔بہت عرض کرنے کی کوشش کی تو کسی کا خاکہ لکھ دیا۔اس سے زیادہ عرض کرنے کی مجھ میں نہ سکت ہے اور نہ ہی اہلیت۔اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ میں نے آج تک کسی خاتون کا خاکہ نہیں لکھا ہے۔کیونکہ جس طرح کے خاکے میں لکھتا ہوں اُن میں صاحب خاکہ کی شخصیت کے خدوخال کو کسی حد تک نہ صرف بگاڑ دیتا ہوں بلکہ کبھی کبھی تو انہیں مسخ بھی کر دیتا ہوں۔مردوں کے خدوخال کو توڑنے مروڑنے کو میں بُرا نہیں سمجھتا۔بلکہ بعض مرد تو ان کی شکلوں کے بگڑنے کے بعد ہی بھلے معلوم ہونے لگتے ہیں۔لیکن خواتین کی اچھی بھلی شکلوں کو، اور اگر خاتون سیدہ شان معراج جیسی ہوں، تو ان کے خدوخال کو بگاڑنے کا حوصلہ کس طنز نگار یا خاکہ نگار میں ہوسکتا ہے۔آسکر وائیلڈ نے موسیقی کی تعریف میں یہ جملہ کہیں لکھا تھا کہ موسیقی کی سب سے بڑی خوبی اس کے آہنگ اور اس کی لے میں بالکل نہیں ہوتی۔موسیقی کا سب سے بڑا معجزہ تو وہ خواتین ہوتی ہیں جو موسیقی کی محفلوں میں اپنی نازک ہتھیلیوں پر اپنی خوب صورت ٹھوڑیوں کو سجائے بڑے انہاک کے ساتھ موسیقی کو سنتی ہیں۔موسیقی ساز میں نہیں، خواتین کے چہروں پر پھیلے ہوئے انہاک میں ہوتی ہے۔دیکھا جائے تو آسکر وائیلڈ نے اس جملہ میں موسیقی کو بھی ایک چہرہ عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس چہرہ کی تشکیل کے لئے خواتین کے خوبصورت نقش ونگار کو مستعار لیا ہے۔

www.taemeernews.com

جمالیات کے ایک اصول کے مطابق انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دنیا کے حسن کو مسخ کرے۔ قانونِ قدرت اس کو مسخ کرے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ حسن جہاں بھی اور جس جگہ بھی نظر آئے اس کی نہ صرف حفاظت کی جائے بلکہ ہو سکے تو اسے انلارج بھی کیا جائے۔ حسن کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ میں ہی اس کائنات کی خوبصورتی مضمر ہے۔

حضرات! آپ میری مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں سیدہ شان معراج کا خاکہ بالکل نہیں لکھ سکتا۔ کچھ یادیں کچھ باتیں ہیں جن کا ذکر البتہ میں کر سکتا ہوں۔ غالباً ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ سیّدہ شان معراج کی ایک غزل دہلی کے ایک رسالہ میں، ان کی اس وقت کی رائج الوقت تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے ایک قاری پہلے تصویر کا مطالعہ کرتا ہے اور بعد میں حسب توفیق غزل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اگر معاملہ کسی خاتون کی غزل اور تصویر کا ہو تو وہ تصویر کے مطالعہ کو ہی کافی سمجھتا ہے۔ ایک دانا کا قول ہے کہ شاعر یا شاعرہ کی تصویر قابلِ اشاعت ہو تو اکثر صورتوں میں اس کا کلام ناقابلِ اشاعت ہوتا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں اس دن مجھے اس دانا کا قول یاد نہیں رہا اور میں نے غلطی سے تصویر کو پڑھنے کے بعد ان کی غزل بھی پڑھ ڈالی۔ اب جو غزل پڑھی تو یہ ان کی تصویر سے بھی کہیں زیادہ اچھی نظر آئی۔ میں نے از راہِ تجسس پھر ان کی تصویر جو دیکھی تو یہ اب کی بار غزل سے بھی زیادہ اچھی نظر آنے لگی۔ اپنی ذات میں پیدا ہونے والے اس تضاد اور کشمکش سے نپٹنے کا مجھے واحد حل یہ نظر آیا کہ میں نے ان کی تصویر غزل سمجھ کر پڑھ لی اور ان کی غزل کو تصویر سمجھ کر دیکھ لیا۔ ظاہر اور باطن میں یا یوں کہیے کہ صورت اور سیرت میں ایسا خوبصورت امتزاج میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ بعد میں دو چار اور رسالوں میں ان کا کلام معہ تصویروں کے پڑھنے کو ملا۔ غالباً ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ ایک دن شان معراج کا خط میرے نام آیا جس میں میرے اس مضمون کی بہت تعریف تھی جو میں نے اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے انتقال پر اُن دنوں لکھا تھا۔ خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ جتنے خوبصورت شعر یہ کہتی ہیں، اتنی ہی خوبصورت نثر بھی یہ لکھتی ہیں۔ پھر ان سے خط و کتابت کا سلسلہ

www.taemeernews.com

شروع ہوگیا۔ مگر ان سے کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی۔ غالباً ۱۹۸۳ء میں میرے دورہ، جاپان کے سلسلہ میں کوئی محفل غالب اکیڈیمی میں منعقد ہوئی تھی۔ جلسہ سے چار پانچ دن پہلے میں ایک ٹریفک حادثہ میں بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ چہرے اور ہاتھ پر چوٹیں آئی ہوئی تھیں۔ مگر جلسہ میں میری شرکت ضرورت تھی۔ میں پٹیوں میں بندھا اسٹیج پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے برابر ایک خاتون آکر بیٹھ گئیں۔ پوچھنے لگیں "آپ ہی مجتبیٰ حسین ہیں؟" میں نے شان معراج کو بیچارگی سنتے ہوئے کہا "چار پانچ دن پہلے تک تو میں ہی مجتبیٰ حسین تھا۔ اب ٹریفک حادثہ کے بعد جو کچھ بھی اور جتنا کچھ بھی مجتبیٰ حسین باقی رہ گیا ہے وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔" بڑی تشویش کے ساتھ حادثہ کی تفصیلات پوچھتی رہیں۔ رونق رضا صاحب مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد سے شان معراج اور رونق رضا صاحب جب بھی دہلی آتے تو مجھ سے ضرور ملتے اور ہر بار شاہ جہاں پور آنے کی دعوت دیتے۔ میں نے شانِ معراج کو اردو کی دیگر شاعرات سے بالکل مختلف پایا۔ ہمارے ہاں ایسی شاعرات کی اکثریت ہے جنہیں مشاعروں کے اسٹیج پر "ڈیکوریشن پیس" کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں جو ترنم سے اپنا کلام نہیں سناتیں بلکہ اپنے کلام سے ترنم سناتی ہیں۔ ایسی شاعرات کی بدولت مشاعرہ اور محفل موسیقی کا فرق مٹتا جارہا ہے۔ شان معراج اپنے کلام کو پیش کرنے کے لئے ترنم کو زحمت نہیں دیتیں۔

شان معراج شعر گوئی کی نزاکتوں اور باریکیوں سے تو واقف ہیں ہی، وہ ادب کا بہت نکھرا ستھرا ذوق رکھتی ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ نری شاعرہ نہیں ہیں بلکہ ادب کی ایک اچھی ناقد بھی ہیں۔ شان معراج نے خدا کے فضل سے مزاج بھی شاعرانہ پایا ہے۔ ان کا کوئی پروگرام پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے دہلی آکر مجھے فون کیا۔ میں ان سے ملنے کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو کب کی شاہ جہاں پور واپس جاچکی ہیں۔ کئی بار یوں بھی ہوا کہ دہلی میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ دوسرے دن صبح کی گاڑی سے شاہ جہاں پور واپس جارہی ہیں۔ تین دن بعد ان کا فون آیا کہ وہ ابھی تک دہلی میں موجود ہیں۔ بس یوں ہی

www.taemeernews.com

جانے کو جی نہیں چاہا تو رک گئیں۔ ایک بار یہ کسی مشاعرہ میں شرکت کے لئے حیدرآباد گئیں۔ان کے حیدرآباد پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ جس مشاعرہ میں شرکت کے لئے یہ گئی تھیں وہ کسی وجہ سے ملتوی ہوگیا۔

میں نے سوچا کہ مشاعرہ کے التوا سے یہ یقینا بہت اداس ہوئی ہوں گی لیکن واپس آئیں تو خلاف توقع بہت خوش تھیں۔ کہنے لگیں مشاعرہ کے ملتوی ہونے سے بہت سے فائدے ہوئے۔ایک تو یہ کہ دوسرے شاعروں کا کلام نہیں سننا پڑا۔ان کے بے ہنگم کلام پر ان کے کلام سے کہیں زیادہ بے ہنگم داد نہیں دینی پڑی۔مشاعرہ تو خیر ملتوی ہوگیا لیکن زندگی میں پہلی بار کلام نہ سنانے کا معاوضہ بھی وصول کیا اور سو فائدوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آپ کے شہر کو ذرا اطمینان سے دیکھنے کا موقع ملا۔حیدرآباد شہر کی تعریف کرتی جاتی تھیں اور ہماری ذات میں جتنی اچھائیاں انہیں اب تک نظر آئی تھیں انہیں شہر حیدرآباد سے منسوب کرتی جاتی تھیں۔

شان معراج کے مزاج میں ایک عجیب سا تلون ضرور موجود ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ زندگی گزارنے کے لیے خوش مذاقی کو نہایت ضروری تصور کرتی ہیں۔میں ان کی شاعری کا ادنیٰ سا پرستار ہوں اور میری یہ دعا ہے کہ وہ اردو ادب کو اپنے خوبصورت شعروں سے مالا مال کرتی رہیں۔رونق صاحب کے انتقال کے بعد اگرچہ وہ بجھ سی گئی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ زندگی کا ادراک انہیں جینے کا پھر ایک نیا حوصلہ اور نیا سلیقہ عطا کرے گا۔

وہ کون شخص تھا کل رات بزمِ یاراں میں
جو قہقہوں میں بھی شامل تھا سوگوار بھی تھا

(1989)

www.taemeernews.com

استاد محمود مرزا

دھرپد دھمار، ٹھمری خیال، دادرا اور بھیرویں نہ جانے یہ سب کیا ہیں۔ اگر راگ ہیں تو کیسے راگ ہیں؟ کیوں ہیں؟ کیسے گائے جاتے ہیں اور کب گائے جاتے ہیں؟ یہی نہیں ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تان پورہ، طنبورہ، ستار، وینا، سنتور، اور سرود میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ہمیں تو یہ سب ایک ہی طرح کے ساز لگتے ہیں۔ غرض موسیقی کے بارے میں ہمارے سامنے کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ بھینس کا معاملہ تو پھر بھی دوسرا ہے کہ اگر کوئی راگ اس کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ جگالی ہی کرتی رہ جائے گی۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ان سازوں کو سن کر جگالی تک نہیں کر سکتے۔ ویسے ہندوستانی موسیقی کے کلاکاروں کے ریاض اور بھینس کی جگالی میں بھی ہمیں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی کام کو ایک لمبے عرصہ تک بلا وجہ اور متواتر انجام دینا ہوتا ہے۔ بھینس کی جگالی تو خیر پھر بھی قابل قبول ہے کہ اس سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی جب کہ موسیقار کا ریاض الامان والحفیظ۔ سوچنا پڑتا ہے کہ خدا نے کسی کو اچھی آواز عطا کی، سریلا گلا دیا، بہت اچھا کیا۔ لیکن ہم جیسوں کو کان عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مبادا یہ نہ سمجھئے کہ ہم موسیقی کے مخالف ہیں بلکہ آج جو ہم یہ مثالی صحت رکھتے ہیں تو اس کا سبب موسیقی ہی ہے۔ یہ بھی نہ سمجھئے کہ موسیقی سننے سے آدمی کی صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ ہماری صحت کا اصل راز یہ ہے کہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں ہم ایک ایسے گھر میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں کلاسیکی موسیقی کے ایک نامی گرامی استاد رہا کرتے تھے۔ علی الصبح جونہی وہ ریاض کی خاطر راگ الاپنا شروع کرتے تھے تو ہم بے ساختہ گھر سے باہر نکل جاتے تھے اور اس وقت تک چہل قدمی کرتے رہتے تھے جب

www.taemeernews.com

تک کہ ان کا ریاض ختم نہیں ہوجاتا تھا۔ ہماری یہ علی الصبح جاگنے کی عادت اور لگاتار چہل قدمی کرنے کی بیئت ان ہی دنوں کی یادگار ہے۔ موسیقی تو خیر ہماری سمجھ میں نہیں آئی البتہ دیکھتے ہی دیکھتے صحت بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس طرح کلاسیکی موسیقی سے ہماری صحت کا تعلق نہایت گہرا ہے۔ یوں بھی ہم بقول یوسفی ہمیشہ سے بُری صحبت اور اچھی صحت کے قائل رہے ہیں۔

یاد ش بخیر! بہت عرصہ پہلے ایک دوست کے اصرار پر کلاسیکی موسیقی کے ایک پروگرام میں ہمیں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہمارے سامنے ایک نوجوان جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ گلوکار کوئی پکا گانا گا رہا تھا اور اپنے فن کی اس معراج پر پہنچ چکا تھا جہاں راگ الاپنے اور پانی کے غرارے کرنے میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ماہرین موسیقی کہتے ہیں کہ راگ کا یہ نہایت تخلیقی لمحہ ہوتا ہے۔ نوجوان غالباً اپنی کم علمی اور کوتاہی کی وجہ سے ان لگاتار غراروں سے تنگ آچکا تھا۔ لہٰذا اس نے لڑکی کی توجہ ان غراروں سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کرانے کی خاطر اس کے حسن کی تعریف شروع کردی۔ مگر راگ کے طوفانی شور میں لڑکی کو کچھ نہ سنائی دیا۔ اس پر لڑکی نے کہا ''اس گلوکار کے بیہودہ شور کی وجہ سے میں تمہاری اچھی اچھی باتیں سن نہیں سکتی۔ چلو باہر چلتے ہیں۔''

اب یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ موسیقی سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود ہماری دوستی استاد محمود مرزا سے ہے جو ستار نوازی کے معاملہ میں عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ ستار کی دنیا میں وہ نہایت اونچے درجہ کے ستار نواز سمجھے جاتے ہیں۔ استاد محمود مرزا سے ہماری ملاقات دس برس پہلے اس وقت ہوئی تھی جب وہ لندن سے دہلی آئے ہوئے تھے (جو وہ ہر سال آتے رہتے ہیں)۔

محمود مرزا پچھلے ستائیس برسوں سے لندن میں مقیم ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب ہمیں لندن میں ڈیڑھ مہینہ قیام کرنے کا موقع ملا تھا تو یہ اپنا ستار اٹھا کر روم میں کوئی پروگرام پیش کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ اس پر ہم نے بعد کی ایک ملاقات میں ان سے کہا تھا کہ جب لندن ہماری آمد کی وجہ سے جل رہا تھا تو آپ روم میں ستار بجا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہم نے اس شہرہ آفاق کہاوت سے استفادہ کیا تھا جس کے

www.taemeernews.com

مطابق جب روم جل رہا تھا تو نیرو بنسری بجا رہا تھا۔ یوں بھی موسیقی اور آگ لگانے کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ میاں تان سین کے بارے میں تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ ماچس کا سہارا لیے بغیر صرف اپنے دیپک راگ کی مدد سے چراغوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اکثر لوگ نظریں بچا کر میاں تان سین کے دیپک راگ سے اپنی بیڑیاں تک جلا لیتے تھے۔

موسیقی کے فن سے ہماری اس گہری عدم واقفیت کے باوجود محمود مرزا سے ہماری دوستی کا یہ عالم ہے کہ جب بھی وہ سال میں ایک مرتبہ ہندوستان آتے ہیں تو ان کا زیادہ تر وقت ہمارے ساتھ اور ہمارا زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گذرتا ہے۔ محمود مرزا خالصتاً دہلی والے ہیں۔ دہلی کے مخصوص رکھ رکھاؤ اور اس کی تہذیب کے پروردہ۔ پچھلے پچیس برسوں میں ہمیں خود دہلی میں کوئی خالص دہلی والا نہیں ملا۔ ایک محمود مرزا ملے تو وہ بھی لندن میں رہتے ہیں۔ یورپ میں ان کی بڑی دھاک ہے۔ جگہ جگہ ان کے کنسرٹ ہوتے رہتے ہیں اور خوش جمالوں کا ایک جم غفیر ہمیشہ ان کی شاگردی میں رہتا ہے۔ برطانیہ کی دو ایک یونیورسٹیوں میں بھی وہ ہندوستانی موسیقی کے استاد رہ چکے ہیں۔ محمود مرزا کے لئے موسیقی نہ صرف ایک شوق ہے بلکہ مقصد حیات بھی ہے۔ محمود مرزا نے (جن کی عمر اب ساٹھ برس کی ہو چکی ہے) چھ سال کی عمر میں اپنے ماموں استاد حیدر حسین خاں کی سرپرستی میں ستار بجانا شروع کیا۔ گیارہ سال کی عمر سے انہوں نے عوام کے سامنے اپنے پروگرام پیش کرنا شروع کر دیئے تھے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ محمود مرزا ابھی تیرہ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو کے مسلمہ فن کار بن چکے تھے۔ اتنی کمسنی میں آل انڈیا ریڈیو کا مسلمہ فن کار بن جانا اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ وہ جب تک ہندوستان میں رہے اپنے فن کے ذریعہ دھوم مچاتے رہے۔ حکومت کی جانب سے بیرونی ممالک کو بھیجے جانے والے موسیقاروں کے وفود میں بھی وہ شامل رہے۔ لیکن ایسے ہی ایک بیرونی دورہ میں ان کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ خوش جمالوں اور خوش خصالوں کے شہر لندن میں آباد ہو گئے۔ پچھلے ستائیس برسوں سے وہ لندن میں رہتے ہیں اور سال میں دو ایک مہینوں کے لئے ہندوستان

www.taemeernews.com

ضرور آجاتے ہیں تا کہ اپنے ملک کی جڑوں کے علاوہ اس کی جڑی بوٹیوں سے بھی ان کا تعلق بنا رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم ستار نواز محمود مرزا کو بالکل نہیں جانتے۔ہم تو اس محمود مرزا کو جانتے ہیں جو ایک شخص ہے۔ہم اکثر مذاق میں ان سے کہتے رہتے ہیں کہ مرزا صاحب آپ ستار نواز نہیں ہیں بلکہ خود ایک ستار ہیں۔ایک ایسا ستار جس کی ذات میں انسانیت، محبت، اخوت، خلوص، دوستی، شائستگی اور اعلیٰ ظرفی کے ساتوں تار کچھ اس طرح ٹھنا ٹھن تنے ہوئے ہیں کہ کبھی کسی تار کو وقت بے وقت اور بلا وجہ کسنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔(آپ نے دیکھا ہوگا کہ ستار نواز جب کوئی راگ بھول جاتا ہے یا ٹھیک سے بجا نہیں پاتا تو ایک انجان سی خود اعتمادی، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک پشیمانی کے جذبہ کے تحت، ستار کے کسی نہ کسی تار کو خواہ مخواہ ہی کسنا شروع کر دیتا ہے)۔محمود مرزا ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ ان میں روایتی موسیقاروں کا سا کوئی بھی تصنع نہیں ہے۔نہ بیجا نخرا ہے نہ بیجا غمزہ۔حد تو یہ ہے کہ وہ لباس بھی موسیقاروں کا سا نہیں پہنتے۔ہمیشہ سوٹ بوٹ یا عصری لباس میں ملبوس ہوں گے۔ہمارے بعض موسیقار کچھ ایسا حلیہ بنائے رکھتے ہیں اور کچھ اس طرح کے کپڑے زیب تن کرتے ہیں کہ بسا اوقات تو ان کی جنس تک مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ نہایت باذوق اور پڑھے لکھے آدمی ہیں۔انگریزی اور اردو زبان وادب پر انہیں گہرا عبور حاصل ہے۔لندن سے جب بھی ہمیں کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں خط لکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑنے کے لئے نہیں بلکہ قلم کو پکڑنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔(مگر کیا کریں ان کے ماموں استاد حیدر حسین خاں جو بیچ میں آ گئے تھے)۔ادب، آرٹ، موسیقی اور کلچر کے جدید ترین رجحانات سے وہ جتنا واقف ہیں اتنا تو ہم بھی واقف نہیں ہیں اور ہم بھی کیا ہیں۔

محمود مرزا نے یوروپ کے خوش جمالوں کے بیچ رہنے کے باوجود شادی نہیں کی۔ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی کیا کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر موسیقار خود اپنی ہی اولاد کے ساتھ یتیموں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ابھی اولاد چار پانچ برس کی بھی نہیں ہو پاتی کہ

www.taemeernews.com

اسے زبردستی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھا دیتے ہیں۔ یہ اولاد موسیقی کی تعلیم تو حاصل کر لیتی ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گلی ڈنڈا کیسے کھیلا جاتا ہے اور آنکھ مچولی کھیلنے، اور وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے میں، کتنا لطف آتا ہے۔ ہمیں تو خود محمود مرزا پر بھی ترس آتا ہے کہ چھ برس کی عمر میں ہی وہ پانچ فیٹ لمبے ستار کو گود میں لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں بھی اتنی چھوٹی تھیں کہ ساتوں تاروں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں لہذا ستار کے تاروں کو کسنے کی بجائے ان کی انگلیوں کو کسنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ غرض اولاد کو نہ پیدا کر کے محمود مرزا نے اپنی اولاد کے لئے جس پیار اور محبت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ایسے سعادت مند والدین اب کہاں پیدا ہوتے ہیں جو اولاد ہی کو نہ پیدا کریں۔

محمود مرزا باتیں بھی بڑے پتہ کی کرتے ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا کہ ایک زمانہ میں مغرب میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا بڑا شہرہ تھا۔ ہر کوئی اسے سیکھنے کو دوڑتا تھا۔ اب کیا حال ہے؟ بولے "یہ شوق تو صرف شکار کو پھانسنے کی خاطر ڈالے جانے والے دانہ کی تعریف میں آتا تھا۔ اس شوق کے زیر اثر ہندوستانی ماہرین موسیقی جوق در جوق مغرب میں جا آباد ہوئے۔ کچھ عرصہ تک مغرب اور مشرق کے درمیان موسیقی کا یہ دو طرفہ ٹریفک جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس آمد و رفت کی وجہ سے خود ہندوستانی موسیقی مغربی موسیقی کے زیر اثر آتی چلی گئی۔ چنانچہ آج آپ ہندوستانی فلموں کی موسیقی کو دیکھ لیجئے کہ اب اس میں کتنی مشرقیت باقی رہ گئی ہے۔ سیاسی سامراجیت بھلے ہی ختم ہو گئی ہو لیکن مغرب کے کلچر کی سامراجیت تو اب شروع ہوئی ہے۔"

محمود مرزا کی دوستی ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے اور ان کے بارے میں اگر ہم لکھنے پر آئیں تو دفتر کے دفتر لکھ دیں۔ لہذا ہمارے تھوڑا لکھے کو بہت جانیے اور ہو سکے تو اسے ذہن میں انلارج کر لیجئے۔ چلتے چلتے ایک بات اور سن لیں۔ ایک دن ہم نے محمود مرزا سے کہا کہ قبلہ مغرب میں موسیقی کو لکھنے کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اب تک موسیقی سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ اسے لکھنے کی صورت کیوں نہیں نکالی جاتی۔ بڑی

بے ساختگی کے ساتھ معصوم سی صورت بنا کر بولے "لکھی تو جا سکتی ہے لیکن کس رسم الخط میں؟ فارسی میں یا دیوناگری میں؟ پھر لکھنے کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس میں کتابت کی غلطی کا اندیشہ بھی تو لگا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں تو آپ جیسے ادیب بھی اپنی شخصی غلطیوں کو کاتب کی غلطی کے کھاتے میں ڈال کر باعزت بری ہو جاتے ہیں۔"

محمود مرزا کی بذلہ سنجی، خوش مذاقی اور حاضر جوابی کے بارے میں پھر کبھی لکھیں گے۔ پہلے وہ ہندوستان سے جائیں تو سہی۔

(1996)

www.taemeernews.com

رشید قریشی

رشید قریشی (جنہیں میں احتراماً رشید بھائی کہتا ہوں) کے بارے میں کچھ لکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ پہلی مشکل تو یہ کہ وہ مجھ سے عمر میں خاصے بڑے ہیں۔ اور دوسری مشکل یہ کہ رشید قریشی صرف رشید قریشی نہیں ہیں بلکہ کئی "رشید قریشیوں" یا یوں کہئے کہ "رشیدانِ قریش" کا مجموعہ ہیں۔ ایک رشید قریشی تو وہ ہیں جو حکومتِ آندھرا پردیش کے محکمۂ جنگلات کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں۔ (یہ بہت تھوڑے سے رشید قریشی ہیں) دوسرے رشید قریشی وہ ہیں جو اپنے مخصوص لطیفوں اور چٹکلوں کے ذریعہ ہمیشہ اپنے اطراف قہقہوں کی ایک قوسِ قزح تانے رہتے ہیں اور بات بات پر دھاچوکڑی کا ساماں باندھے رہتے ہیں (یہ حد سے زیادہ رشید قریشی ہیں) تیسرے رشید قریشی وہ ہیں جو مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں اور اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعہ اپنے قاری کے وجود میں طراوٹ اور نکھار کا ایک آبشار گراتے ہیں۔ چوتھے رشید قریشی ڈرامہ نگار ہیں۔ پانچویں رشید قریشی افسانہ نگار ہیں۔ چھٹے رشید قریشی وہ ہیں جو صبح کی اولین ساعتوں میں یادِ الٰہی میں کچھ اس اہتمام سے غرق ہو جاتے ہیں جیسے دنیا کی ساری عبادت گذاری ان پر ختم ہو رہی ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے صبح والا رشید قریشی دن والے رشید قریشی کو بالکل نہیں جانتا اور دن والا رشید قریشی رات والے رشید قریشی سے نا آشنا ہے۔ آپ ہی سوچیے جب ایک رشید قریشی خود دوسرے رشید قریشی کو نہیں پہچان سکتا تو پھر ایک انسان (میں) دوسرے انسان (رشید قریشی) کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ اور ہاں ایک رشید قریشی اور بھی ہیں جو اپنی بیوی کی فرمائشوں (جو نہ کبھی پوری ہوتی ہیں اور جو نہ کبھی ختم ہونے پاتی ہیں) اور بچوں کی تعلیمی فیس

www.taemeernews.com

(جو کبھی کبھار دیدی جاتی ہے) سے ہمیشہ حیران اور پریشان رہتے ہیں۔

دیکھئے صاحب! رشید قریشیوں کی سات قسمیں تو میں نے ابھی گنادی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں اس ہفت پیکر انسان کے بارے میں بات کہاں سے شروع کروں اور اگر شروع کروں تو اسے کہاں ختم کروں۔ میں نے ان کے روپ اور بہروپ دونوں دیکھے ہیں۔ آدمی کیا ہیں بالکل چوں چوں کا مربہ ہیں۔ دفتر میں اسسٹنٹ سکریٹری کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اپنے اطراف فائلوں کی ایک فصیل سی کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر کچھ ایسی بے چارگی ہوتی ہے جو عموماً ہمارے ملک کے سرکاری ملازمین کے حُلیہ کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ وہ آندھرا پردیش سکریٹریٹ کے محکمہ جنگلات کے اسسٹنٹ سکریٹری ہیں اور یہ جو ہر سال آندھرا پردیش میں امساک باراں ہوتا ہے تو اسے بہ پابندی منعقد کرنے کے ذمہ دار وہی ہوتے ہیں۔ یوں بھی وہ اتنے ذمہ دار آدمی ہیں کہ ہر بحران کی ذمہ داری آنکھ بند کر کے ان پر عاید کی جاسکتی ہے۔ مگر اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو حکومت آندھرا پردیش کا ہے کہ اس نے ''منگل'' کے آدمی کو ''جنگل'' میں پھنسا دیا ہے۔ میں ان کی دفتری شخصیت سے بہت کم واقف ہوں۔ لیکن میں نے انہیں جب بھی دفتر میں دیکھا بڑے انہماک کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو پورا کرتے دیکھا۔ فائیل کو اس انہماک اور اشتیاق سے پڑھیں گے جیسے وہ فائیل نہ ہو کوئی جاسوسی ناول ہو۔ فائیلوں کو ادب کا درجہ رشید قریشی نے ہی عطا کیا۔ آندھرا پردیش سکریٹریٹ میں ان کا جو کمرہ ہے اس کی کھڑکیاں حسین ساگر جھیل کی طرف کھلتی ہیں۔ اور وہاں سے منظر کچھ ایسا دلفریب اور دلکش ہوتا ہے کہ کوئی بد ذوق ہی اس منظر کو سامنے رکھ کر دفتر کی فائلیں دیکھنے کی غلطی کر سکتا ہے۔ اب یہ ان کی شخصیت کا تضاد نہیں تو اور کیا ہے کہ جس منظر کے نظارہ سے متاثر ہو کر شاعر شعر کہتا ہے، مصور تصویر بناتا ہے وہ اس منظر کے روبرو نظریں جھکائے ریاست کے جنگلوں کی بربادی کا حال لکھتے رہتے ہیں۔ ایسے حسین منظر کی ایسی توہین شاید ہی کوئی کر سکے۔

ایک دن میں نے پوچھا تھا ''اس دلکش منظر کے ایماء پر آپ کا جی شاعری

www.taemeernews.com

کرنے کو چاہتا ہوگا۔" بولے "کیا خاک شاعری کروں گا۔ یہ منظر تو میرے لیے وبالِ جان بن گیا ہے۔ جو کوئی بھی آتا ہے مجھ کو نظر انداز کر کے صرف منظر کو دیکھتا رہ جاتا ہے اور پھر منظر سے نظریں ہٹا کر کہتا ہے۔ رشید صاحب! کیا حسین منظر ہے۔ بس اسی بات پر چائے منگوائیے۔ چائے کے بغیر اس منظر کا لطف نہیں آئے گا۔ آپ ہی بتائیے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ منظر بھی دکھائیے اور چائے بھی پلائیے۔ اکثر لوگ تو میرے پاس صرف 'پکنک' منانے آجاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ "رشید صاحب:۔ سارے شہر میں آپ کے کمرہ سے بہتر کوئی اور پکنک اسپاٹ نہیں ہے۔"

دفتر میں آنے والے دوستوں کی چائے کے علاوہ اور کیا مدارتیں ہوتی ہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ البتہ میں ان کی ذات کے اس پہلو سے بخوبی واقف ہوں جو بڑا انسوز، بڑا بذلہ سنج، بڑا ظریف اور بڑا لطیفہ باز ہے۔ الغرض یہ کہ رشید قریشی لطیفوں کا "گشتی گودام" ہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں لطیفے انہیں یاد رہتے ہیں بلکہ یہ بھی یاد رہتا ہے کہ کس کو کون سا لطیفہ کب سنایا تھا۔ رشید قریشی سے میرے مراسم دس سال پرانے ہیں مگر ان دس برسوں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ایک دفعہ سنایا ہوا لطیفہ مجھے دوبارہ سنایا ہو۔ ورنہ میں نے ایسے بہت سے لطیفہ باز دیکھے ہیں جو دس برسوں سے ایک ہی لطیفہ بار بار اور مسلسل سناتے آرہے ہیں۔ رشید قریشی کی ذہانت کا یہ عالم ہے کہ پلک جھپکتے میں ایک نیا لطیفہ تصنیف کر دیتے ہیں اور لطیفہ سنا کر یوں انجان بن جاتے ہیں جیسے لطیفے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے تصنیف کردہ لطیفہ کے حقوق بڑی خوش اسلوبی سے دوسرے کے نام منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں کہ ان کے کئی لطیفوں کے سنگین نتائج کا سامنا مجھے کرنا پڑتا ہے۔ ایک بار ایک سیاسی شخصیت کی ۶۰ ویں سال گرہ منائی جانے والی تھی۔ رشید قریشی نے فوراً لطیفہ گھڑا کہ جب ان صاحب کی ۶۰ ویں سال گرہ کی تیاریاں ہونے لگیں تو ان صاحب کی بیوی نے ان کے احباب سے پوچھا "آپ لوگ ان دنوں کس تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہیں؟"

احباب نے کہا "ہم آپ کے شوہر کی ۶۰ ویں سال گرہ منا رہے ہیں۔"

www.taemeernews.com

اس پر ان صاحب کی بیوی نے کہا۔ ''آپ لوگ اب ان کی ۶۰ ویں سال گرہ منا رہے ہیں! میں تو شادی کی تاریخ سے ہی آپ کے دوست کی ۶۰ رویں سال گرہ منا رہی ہوں۔ اور یوں مجھے ان کی ۶۰ ویں سال گرہ مناتے ہوئے پورے ۳۰ برس بیت گئے۔''

رشید قریشی نے یہ لطیفہ بنایا اور اسے میرے نام سے منسوب کر کے ناج میں چھوڑ دیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ چند دن بعد وہ ۶۰ سالہ بزرگ مجھ سے ملے تو بڑے برہم ہوئے اور کہنے لگے'' ایسے چھچھورے لطیفے میرے تعلق سے بناتے ہو، میں تو تمہیں اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔''

اب میں سخت حیران کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ میں نے ان بزرگ سے بڑی منت سماجت کی کہ وہ لطیفہ مجھے سنائیں تاکہ میں اس لطیفہ کی ذمہ داری کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں۔ ان بزرگ نے مجھے تخلیہ میں لے جا کر جھجکتے جھینپتے وہ لطیفہ سنایا اور پھر پوری برہمی کے ساتھ کہنے لگے۔ ''تمہیں میرے خانگی معاملات میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے اس لطیفے سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا تو وہ اور بھی خفا ہو گئے اور بفضل تعالیٰ آج تک مجھ سے خفا ہیں۔

ان کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے بعد میں نے اس لطیفے کے سلسلۂ حسب نسب تک پہنچنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ اس سلسلۂ حسب نسب کے اولین سرے پر لطیفہ کے جد امجد رشید قریشی بڑی متانت کے ساتھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

اس سانحہ کے بعد سے جب بھی کوئی مجھ سے خفا نظر آتا ہے تو میں فوراً پوچھ لیتا ہوں'' بھئی خفا کیوں ہو؟ کہیں تم نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنا۔ تم یقین کرو کہ یہ لطیفہ میرا نہیں رشید قریشی کا ہوگا۔''

ایسے کئی لوگ ہیں جن سے میرے تعلقات بڑے خوش گوار تھے مگر اب ان تعلقات کے درمیان رشید قریشی کے لطیفے حائل ہو گئے ہیں۔ میں رشید قریشی سے کہتا ہوں۔

''رشید بھائی! خدا کے لیے اب لطیفوں کا سلسلہ بند کیجیے۔ جدھر جائیے آپ کے لطیفے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ آپ کے لطیفے تو چلتے رہیں گے لیکن میرا سڑکوں پر چلنا پھرنا مشکل ہو جائے

www.taemeernews.com

گا۔'' مگر وہ نہیں مانتے اور چپکے سے کوئی تازہ لطیفہ تخلیق کر کے سماج میں چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک دن میں نے ان سے کہا تھا ''رشید بھائی! آخر آپ اپنے لطیفے میرے نام سے کیوں منسوب کرتے ہیں؟''

وہ بولے ''بھئی! میں ایک باوقار اور عزت دار آدمی ہوں۔ ایسے لطیفے اپنے نام سے کس طرح سنا سکتا ہوں؟'' آپ ہی انصاف کیجیے اس جواب کے بعد بھلا میں ان سے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

رشید قریشی کو انواع واقسام کے لطیفے یاد ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر مسلسل لطیفے سنانے کا کوئی عالمی مقابلہ ہو تو رشید قریشی اس میں پہلا انعام ضرور حاصل کریں گے۔

ایک بار ہم دونوں کو بمبئی جانے کا موقع ملا۔ تین دن تک ہم ساتھ رہے اور اس سارے عرصے میں رشید قریشی نے لطیفے سنانے اور میں نے لطیفے سننے کے سوائے کوئی کام نہیں کیا۔ رشید قریشی کسی بھی محفل میں چلے جائیں گے تو فوراً اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالیں گے۔ ان کے لطیفوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ بالغوں کے لطیفے اور نابالغوں کے لطیفے۔ بالغوں کے لطیفے وہ صرف نابالغوں کو سناتے ہیں۔ (اس معاملہ میں ان کا استدلال یہ ہے کہ نابالغوں کو بالغوں کے لطیفے سنائے جائیں تو اس سے ان کے جلد بالغ ہونے کے امکانات کافی روشن ہوجاتے ہیں) رشید قریشی فطرتاً مزاح نگار ہیں۔ ان کی فطرت، شوخی، شگفتگی، شرارت اور جوانی سے عبارت ہے، کبھی نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ اسی شوخی وشرارت نے انہیں اب تک جوان رکھا ہے۔ اگرچہ عمر کی اس منزل کو پہنچ گئے ہیں جہاں آدمی اپنے آپ کو سمیٹنے لگتا ہے۔ مگر رشید قریشی اپنی عمر سے بے نیاز ہو کر زندگی کی طرف یوں لپکتے ہیں جیسے بچہ کسی کھلونے کو پکڑنے کے لئے لپکتا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر بڑھاپے کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے۔ اپنے طرز عمل اور سرگرمیوں سے یوں ظاہر کریں گے جیسے وہ اب بھی جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ہوں۔ کسی کے حسن کا ذکر ان کے سامنے کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان کا چہرہ کس طرح نور سے دمک اٹھتا ہے۔ جیسے پیتل کے کسی برتن کو خوب مانجھ کر تمتماتے ہوئے سورج کے سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ اس قسم کا نور ان کے چہرے پر دو ہی صورتوں میں جھلکتا

www.taemeernews.com

ہے۔ ایک تو کسی حسین کا ذکر سن کر۔ دوسرے جب وہ عبادت میں مصروف ہوں۔ حالانکہ دونوں قسم کے "انوار" میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مگر ان کے "زمینی نور" پر "آسمانی نور" کا اور "آسمانی نور" پر "زمینی نور" کا گمان ہوتا ہے۔

بہ حیثیت مزاح نگار میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ زبان ایسی پیاری، شستہ اور لطیف لکھتے ہیں کہ بس مزہ لیتے رہ جائیے۔ مگر مزاح سے کہیں زیادہ میں ان کی شخصیت کے "چومکھے پن" سے متاثر ہوں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں رشید قریشی اپنی رات گزار کر صبح جب طلوع ہوتے ہیں اور عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں تو دنیا کا بڑے سے بڑا متقی اور پرہیز گار شخص بھی ان کی عبادت کے انہماک اور استغراق کا مقابلہ نہیں کر سکتا (یہی وجہ ہے کہ میں انہیں بہت بڑا اداکار بھی سمجھتا ہوں) ایک انکشاف اور بھی کرتا چلوں کہ وہ بہت اچھے موسیقار بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موسیقی سے وہ صرف عبادت کا کام لیتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان کی موسیقی خود ایک عبادت معلوم ہونے لگتی ہے۔ کئی بار سفر میں ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ پہلی بار جب سفر میں ساتھ ہوا اور رشید قریشی رات دیر گئے تک اپنے "بالغوں کے لطیفوں" کے ذریعہ دھما چوکڑی مچانے کے بعد سو گئے تو میں بھی اپنے کمرہ میں جا کر سو گیا۔ مگر علی الصبح میرے کانوں میں بڑی سریلی آوازیں آنے لگیں۔ بڑی ہی پیاری اور دل کش آواز میں کوئی آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر رہا تھا۔ اب میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ یہ سریلی آواز رشید قریشی کی ہوگی۔ اسی لیے میں نے بستر پر پڑے پڑے اپنے "ماحول" کا جائزہ لیا۔ اس ماحول میں "آیاتِ قرآنی" کی تلاوت کا دور دور تک کہیں کوئی امکان نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ رشید قریشی سے بھی میں اس "سعادت" کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ محض تجسس کی خاطر اپنے کمرے سے باہر نکل کر رشید قریشی کے کمرے پر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک مخصوص ٹوپی سر پر اوڑھے ہوئے جانماز پر بیٹھے ہیں آنکھیں نہ صرف بند تھیں بلکہ ان بند آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے۔ میں کچھ ایسی حیرانی سے رشید قریشی کو دیکھتا رہ گیا جیسے چڑیا گھر میں کوئی بچہ پہلی بار شیر کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ بڑی رقت کے ساتھ نہایت سریلی آواز میں تلاوت کر رہے تھے۔ بڑی دیر تک عبادت میں

www.taemeernews.com

مصروف رہنے کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اوپر اٹھائے۔پھر ایک دعا (جو غالباً ان ہی کی نظم کردہ ہے) بڑی سریلی آواز میں پڑھنے لگے۔ دعا پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔اس دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہ اپنے سارے گناہوں کی تفصیل کو شوارہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔اس منظوم دعا میں وہ اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ دنیا کے گنہگار ترین انسان ہیں (حالانکہ ایسا ثابت کرنے کے لیے کسی استدلال یا مثال کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے) اگر آپ ان کے گناہوں کی تفصیل تاریخ وار مثالوں کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں تو ان کی منظوم دعا سنیے جسے وہ انسانوں سے حتی الامکان روپوش رکھتے ہیں۔صاحب دعا کیا ہوتی ہے۔اچھی خاصی ''فردِ جرم'' ہوتی ہے جسے ملزم اپنے آپ پر عاید کرتا چلا جاتا ہے اور پھر خدا سے انصاف کا طلب گار ہوتا ہے۔آپ یقین کریں کہ اگر خدا کی بجائے کوئی پولس والا ان کی دعا سن لے تو کسی وارنٹ کے بغیر انہیں فوراً گرفتار کرلے۔اپنے گناہوں کو جس سلیقے سے وہ ''یاد'' رکھتے ہیں اس سلیقے سے شاید کراماً کاتبین بھی ان کے گناہوں کو قلمبند نہ کرسکیں۔حالانکہ گناہوں کی فہرست تیار کرنے کا فرض تو ''کراماً کاتبین'' کا ہوتا ہے۔تو خیر صاحب ''اقبالِ جرم'' سے فارغ ہونے کے بعد وہ سجدہ میں گر گئے تو بس گرے ہی رہ گئے اور میں ان کے گناہوں کی تفصیل سن کر گم سم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔بڑی دیر کے بعد سجدہ سے اٹھے تو چہرہ پر نور برس رہا تھا۔مجھے عالمِ حیرت میں غرق دیکھا تو فوراً باہر نکل آئے اور آپ یقین کیجیے کہ آتے ہی کمرہ کے باہر میرے کھڑے رہنے کو بنیاد بنا کر ایک پھڑک دار بالغوں والا لطیفہ سنا دیا۔اب میں حیران کہ یہ شخص جو ابھی ابھی بندگی، معصومیت، زہد و تقویٰ، شرافت، نیک نفسی اور خدا ترسی کا پیکر بنا ہوا تھا اچانک کیا سے کیا ہو گیا۔

میں نے کہا ''آپ سے مشکل یہ ہے کہ آپ کی نیکی اور بدی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جاسکتی۔''

بولے ''میاں! سچے اور مکمل انسان کی پہچان یہی ہے کہ اس کی نیکی کا حال خود اسے بھی نہ معلوم ہو۔ہاں اسے اپنی برائیوں کی ضرور خبر ہونی چاہیے۔''

www.taemeernews.com

ان کی بندگی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی آپ کو سناتا چلوں۔ چند برس پہلے حکومت کی جانب سے کسی سرکاری ٹریننگ کے سلسلے میں انہیں آندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں عالم پور بھیجا گیا۔ وہاں وہ ہر صبح ایک درگاہ میں پہنچ جاتے اور گھنٹوں عبادت میں مصروف رہتے۔ ان کے اس انہماک کو دیکھ کر درگاہ کے مجاور نے مشہور کر دیا کہ یہ صاحب درگاہ کے بلاوے پر آئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے عالم پور میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ ایک پہنچے ہوئے بزرگ شہر میں آئے ہیں، جس پر ان کا دل آئے بس اسی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایسا صاحب کرامات کہ اِدھر انہوں نے دعا کی اور اُدھر اس شخص کی زندگی سنور گئی۔ ایک دن یہ علی الصبح درگاہ کے احاطے میں عبادت میں مصروف تھے کہ ایک جواں سال خوش جمال عورت ان کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ رشید قریشی نے دل ہی دل میں خدا کے آگے فریاد کی "اے خدا! میرے تقوے کی ایسی کڑی آزمائش! ابھی تو پلکوں کی نمی بھی سوکھی نہیں۔" کچھ دیر بعد اس عورت نے اچانک ان کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولی "حضرت قبلہ! میری مدد کیجیے۔ میری طرف دیکھیے۔ رائچور سے آئی ہوں۔" رشید قریشی کے پاؤں آنسوؤں سے بھیگنے لگے اور ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ انہوں نے استغفار کے ساتھ عورت کو اپنے قدموں میں سے ہٹایا اور پلٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ مگر کہنے والوں نے اس عورت سے کہہ رکھا تھا کہ یہ بزرگ اتنی آسانی سے کسی کے لیے دعا نہیں کرتے لہٰذا اس نے ان کا دامن بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا اور بولی "حضرت قبلہ! میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔ میرا شوہر مجھ سے متنفر ہوگیا ہے۔ کسی طرح اس کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کیجیے۔"

رشید قریشی دامن کو چھڑا کر آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگے تو وہ تقریباً زمین پر لیٹ گئی اور بولی "صاحب! ان قدموں میں آج میری جان نکل جائے گی" اور دھڑ ادھڑ اپنا سر زمین پر پٹخنے لگی۔

انہیں بہر حال اس عورت سے اپنی جان چھڑانی تھی، لہٰذا انہوں نے جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور اس پر اس عورت کے ناقدرشناس شوہر کے نام صلواتیں لکھ

www.taemeernews.com

کر اس کے حوالے کیں اور کہا۔"جو تم سے متنفر اس سے میں متنفر۔اس درگاہ کا کنکر کنکر متنفر۔رات کو اسے اپنے پائنتی رکھ کر سویا کرو۔"

دو دن بعد رشید قریشی حسبِ معمول درگاہ گئے تو وہ عورت پھر موجود تھی۔اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک تھالی بھی تھی۔جیسے ہی رشید قریشی عبادت سے فارغ ہوئے۔اس نے پھر ان کے پاؤں پکڑ لیے اور وہ تھالی جس میں تھوڑے سے چاول، پان اور سپاری کے علاوہ پانچ روپے بھی رکھے ہوئے تھے ان کے آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔"حضرت قبلہ! آپ کی تعویذ سے میرے شوہر کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔اس لونڈی کا حقیر نذرانہ قبول کیجیے۔"

انہوں نے لاکھ منع کیا مگر وہ عورت نہ مانی اور رشید قریشی کو اپنے دامن میں چاول سمیٹ کر لے جانا ہی پڑا۔اب جو ان کی "کرامات" کا چرچا شہر میں ہونے لگا تو بالکل ادارہ اقوام متحدہ بن گئے۔

کسی کی لڑکی اگر گھر سے بھاگ گئی تو وہ شخص بھاگا بھاگا اپنی فریاد لے کر رشید قریشی کے پاس پہنچ گیا......کسی کے بچے نے دودھ پینا ترک کر دیا تو بچے کی ماں فوراً رشید قریشی کے پاس پہنچ گئی......کسی لڑکی کی ساس نے اسے پیٹا اور وہ رشید قریشی کی امان میں پہنچ گئی......سارے شہر میں چہل پہل سی ہوگئی اور یہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تعویذیں بانٹتے اور نذرانے قبول کرتے رہے۔

رشید قریشی کہتے ہیں وہ دن ان کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ایک مرحلہ پر انہوں نے "تبدیلیِ پیشہ" کی بابت بھی سنجیدگی سے غور کیا تھا مگر صاحب اسی اثناء میں ان کی ٹریننگ ختم ہوگئی اور ایک دن اچانک "حضرت قبلہ" وہاں سے غائب ہو گئے۔سارے شہر میں کہرام سا مچ گیا کہ حضرت ناراض ہو کر کہیں چلے گئے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر آج بھی اس شہر میں کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں آندھرا پردیش کے سکریٹریٹ میں کام کرتا ہوں تو وہ لوگ مجھے زبردستی یہاں سے پکڑ کر لے جائیں گے۔

حال ہی میں سنا ہے کہ تلاشِ حق کے میدان میں رشید قریشی نے ایک قدم اور

www.taemeernews.com

آگے اٹھایا ہے۔ وہ عبادت کے وقت کوتی رنگ کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اور یادِ الٰہی اور ذکرِ نبی میں استغراق اور انہماک کے لیے "ایکتارہ" کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ میرابائی کا راستہ ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہ تھکا ہوا ایکتارہ سوار کہاں تک پہنچتا ہے۔ میرابائی تک بھی پہنچ پایا تو منزل زیادہ دور نہیں رہے گی۔

آپ ہی بتائیے میں ایسے شخص کے بارے میں کیا لکھوں جس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو پر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو دوسرا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے پہلو پر غور کرتا ہوں تو اس میں سے تیسرا پہلو سامنے نکل آتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں رشید قریشی دراصل کئی "رشید قریشیوں" کا مجموعہ ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کون سے رشید قریشی پر لکھوں۔ کتنا لکھوں اور کہاں تک لکھوں۔ اس لیے میں مجبور ہوں کہ ان پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔ پھر رشید قریشی کے بارے میں لکھنا اس لیے بھی مشکل ہے کہ اگر وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو جائیں اور جوابی کارروائی کے طور پر کوئی سنگین لطیفہ میرے نام سے منسوب کر کے سماج میں پھیلا دیں تو پھر بتائیے میں کہاں کہاں منہ چھپاتا پھروں۔ نا صاحب! یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا.......... میں مجبور ہوں میں ان کے بارے میں ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ کیا میری شامت آئی ہے جو ان پر لکھنے چلوں؟

ہاں! میں اتنی دعا ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی شوخی، بذلہ سنجی اور ظرافت کے ذریعے محفلوں میں برسوں قہقہوں کی دولت بانٹتے رہیں اور ان کے دم سے محفلوں میں قہقہوں کا کاروبار چلتا رہے......!

(1980)

www.taemeernews.com

دیوکی نندن پانڈے

یہ پندرہ برس پرانی بات ہے ۔ہندی کے شہرہ آفاق نیوز ریڈر دیوکی نندن پانڈے اور ہم ایک مشترک دوست کے گھر میں بیٹھے تھے۔ایک مرحلہ پر ہمارے دوست کی بیوی نے باورچی خانہ سے اپنے نوکر کو پکار کر کہا "راجو! ذرا یہ ریڈیو تو بند کر دینا۔بڑی دیر سے بلاوجہ چل رہا ہے۔" کچھ دیر بعد باورچی خانہ سے ایک زناٹے دار طمانچے کی آواز آئی اور ہمارے دوست کی بیوی نے اپنے نوکر کو ڈانٹتے ہوئے کہا "تو بڑا کام چور ہوگیا ہے۔کتنی دیر پہلے میں نے تجھ سے ریڈیو بند کرنے کے لئے کہا تھا مگر یہ اب تک چل رہا ہے۔" اس پر نوکر نے روتے روتے کہا "میم صاحب! میں نے تو ریڈیو صبح میں ہی بند کر دیا تھا۔میں خود حیران ہوں کہ یہ اپنے آپ کیسے چل رہا ہے۔ویسے میں ابھی ڈرائینگ روم میں گیا تھا۔وہاں جو ایک لمبے تڑنگے صاحب بیٹھے ہیں ان کے اندر سے بار بار ریڈیو کی آواز آرہی ہے۔یقین نہ آئے تو آپ خود چل کر دیکھ لیجئے۔" نوکر کے اس جواب کو سن کر ہم سب کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوگیا تھا۔اور یہ بھی سچ ہے کہ جب کبھی دیوکی نندن پانڈے کچھ بولتے ہیں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا ریڈیو چل رہا ہے اور وہ اسے بند کرنے کو دوڑ پڑتے ہیں۔آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبروں کے بے مثال نیوز ریڈر پنڈت دیوکی نند ن پانڈے سے کون واقف نہ ہوگا۔(بھلے ہی آل انڈیا ریڈیو کی شدھ ہندی کسی کی سمجھ میں نہ آتی ہو لیکن پانڈے جی کی آواز سب کی سمجھ میں آجاتی ہے) ابھی کچھ برس پہلے تک ان کی آواز ریڈیو پر ہمیشہ گونجا کرتی تھی۔پنڈت جی سے ہماری پندرہ سولہ برس پرانی یاد اللہ ہے۔ہمیں وہ اس لئے بھی پسند ہیں کہ ریڈیو پر تو وہ نہایت شدھ ہندی میں خبریں سناتے رہے ہیں لیکن جب ریڈیو کے مائیکروفون سے ہٹ جاتے ہیں تو لکھنؤ کی خالص اردو بولنا

www.taemeernews.com

شروع کر دیتے ہیں۔ دیوکی نندن پانڈے جہاں بات بات پر لطیفے سنا کر محفل کو زعفران زار بنا تے رہتے ہیں وہیں اچانک اردو کا کوئی شعر سنا کر محفل کو سنجیدہ بھی بنا دیتے ہیں۔ غرض ہمیشہ دھما چوکڑی مچائے رہتے ہیں۔ اگر چہ پنڈت جی اب پچھتر برس کے ہو گئے ہیں لیکن اپنے آپ کو سدا جوان رکھنے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آپ کو ہمیشہ نوجوانوں میں گھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ دس بارہ برس پہلے تک ان سے ہماری کافی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر ملنا جلنا کچھ کم ہو گیا تو ایک دن ہم نے پنڈت جی سے اس کی شکایت کی۔ بولے "یار! اب تم بوڑھے ہوتے جا رہے ہو اور تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ ہم عمروں کی صحبت میں رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔" حالانکہ پنڈت جی ہم سے عمر میں سولہ برس بڑے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین کچھ اس طرح کا ہے کہ آدمی اپنے دل کو مرنے نہ دے۔ چاہے اس کے لیے اس کے جسم کو کتنے ہی عذاب سے کیوں نہ گزرنا پڑ جائے۔ وہ ایک شعر اکثر سناتے ہیں۔

واسطے زندگی کے پال لیا کوئی روگ
صرف صحت کے سہارے زندگی چلتی نہیں

پنڈت جی نے اپنے دل کو جوان رکھنے کے لئے کیسے کیسے خوبصورت روگ پال رکھے ہیں اس کا ہمیں اندازہ ہے۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ ان کے پچھتر سالہ جسم میں اب بھی ایک ایسا دل ہے جو عموماً سولہ سترہ سال کے ایک نوجوان کے جسم میں پایا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی پیدائش ۱۵ فروری ۱۹۲۰ء کی ہے۔ ان کی والدہ ان کے والد کی دوسری بیوی تھیں۔ شادی کے وقت ان کے والد کی عمر پچاس سال اور ان کی والدہ کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ ان کے والد نے عمروں کے اس تفاوت کو دور کرنے کا آسان نسخہ یہ دریافت کیا کہ دھڑا دھڑ بچے پیدا کرنا شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چودہ بچوں کی ایک لمبی قطار لگا دی۔ پنڈت جی ان سب میں بڑے تھے۔ اس غیر منصوبہ بند پیدائش کی وجہ سے کسی بچہ کو یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ اس دنیا میں اس کی آمد کا کیا مقصد ہے۔ پنڈت جی نے جیسے تیسے ۱۹۴۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا اور لکھنؤ سکریٹریٹ میں اسسٹنٹ کے طور پر

www.taemeernews.com

ملازم ہو گئے۔ کالج کے زمانہ سے ہی وہ اسٹیج ڈراموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ لہٰذا لکھنؤ میں سرکاری ملازمت کرنے کے علاوہ ریڈیو ڈراموں میں نہ صرف حصہ لینے لگے بلکہ وقتاً فوقتاً اناؤنسمنٹ کا کام بھی کرنے لگے۔ الہٰ آباد میں فراق گورکھپوری ان کے استاد رہے۔ لکھنؤ آئے تو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن میں ان کی ملاقات ن۔م۔ راشد سے (جو ان دنوں لکھنؤ ریڈیو میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے) ہوگئی۔ ریڈیو کے ابتدائی دنوں میں ن۔م۔ راشد نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی جس کا ذکر وہ بڑی احسانمندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہیں ان کی ملاقاتیں کرشن چندر، جوش ملیح آبادی اور میراجی وغیرہ سے ہوئیں۔ مجاز کے وہ حلقہ بگوشوں میں سے تھے۔ چنانچہ مجاز کے بے شمار لطیفے انہیں یاد ہیں۔ مجاز کے لطیفے سنا کر سب کو تو ہنسا دیتے ہیں لیکن اکثر اوقات خود ان کی آنکھیں مجاز کو یاد کرکے بھیگ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں "لطیفہ اپنی جگہ اور مجاز کی یاد اپنی جگہ۔ آپ لوگوں نے مجاز کو دیکھا ہی کہاں ہے ورنہ اس کے لطیفوں پر یوں نہ ہنستے۔"

ہم ہندی کی دو ہی ایسی شخصیتوں سے واقف ہیں جو اُردو رسم الخط بالکل نہیں جانتیں لیکن اردو والوں سے کہیں زیادہ اچھی اردو بولتے ہیں۔ ایک تو ہمارے اشوک واجپئی ہیں اور دوسرے ہمارے دیوکی نندن پانڈے۔ ایک دن ہم نے پنڈت جی سے پوچھا "آپ تو اردو رسم الخط بالکل نہیں جانتے۔ پھر اتنی اچھی، بامحاورہ اور فارسی آمیز اردو کس طرح بول لیتے ہیں؟" بولے "بے شک میں نے پینتیس برس سے زیادہ عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو سے ہندی میں خبریں پڑھی ہیں لیکن لگ بھگ ساٹھ برسوں سے اردو والوں کی صحبت میں زندگی گزار رہا ہوں۔ کسی زبان کو سیکھنے کے لیے اس زبان کے اہل علم و ادب کی صحبت اس زبان کے رسم الخط سے کہیں زیادہ موثر وسیلہ ہوتی ہے۔" پنڈت جی جب لکھنؤ ریڈیو میں جز وقتی آرٹسٹ کے طور پر کام کرتے تھے اس زمانہ میں آل حسن اور سعیدہ رضا بھی وہیں کام کرتے تھے۔ آزادی کے بعد جب دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کو اناؤنسروں اور نیوز ریڈروں کی ضرورت لاحق ہوئی تو پنڈت جی کی آواز ریکارڈ کرکے دہلی بھیجی گئی۔ ان کی آواز ایسی تھی کہ ان کا انتخاب تو ہونا ہی تھا۔ اس طرح ۲۱/ مارچ ۱۹۴۸ء کو پنڈت جی نے

www.taemeernews.com

پہلا نیوز بلیٹن پڑھا۔آل حسن بھی چیف نیوز ریڈر کے طور پر دہلی اسٹیشن آ گئے تھے لیکن بعد
میں بی۔بی۔سی میں چلے گئے۔پنڈت جی کو اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں دہلی اسٹیشن سے
اردو کی خبریں صرف حیدرآباد اور کشمیر کے لئے نشر کی جاتی تھیں۔رات کے بلیٹنوں میں
ہندی اور انگریزی خبروں کے بعد دہلی اسٹیشن ساڑھے نو بجے بی۔بی۔سی سے خبریں نشر
کرتا تھا لیکن حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے وقت بی۔بی۔سی نے کچھ ایسی خبریں نشر کیں کہ
آل انڈیا ریڈیو سے بی۔بی۔سی کی خبروں کو نشر کرنے کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔پنڈت جی
کی پاٹ دار اور طرحدار آواز لگ بھگ چالیس برسوں تک آل انڈیا ریڈیو پر گونجتی رہی۔وہ
اکثر کہتے ہیں کہ اس عرصہ میں آل انڈیا ریڈیو سے زیادہ تر بُری خبریں میں نے ہی نشر
کیں۔مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، گوبند بلبھ پنت اور نہ جانے کتنوں کے انتقال کی
خبریں نشر کرنے کے لئے انہیں کی خدمات حاصل کی گئیں۔انہیں ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء کا ایک
نیوز بلیٹن اب تک یاد ہے۔اس دن پنڈت جی اپنے دل کو جوان رکھنے کی کوشش میں ایک
فوجی افسر کے ساتھ یونہی گھومنے چلے گئے۔فوجی افسر نے ان کے منع کرنے کے باوجود
ایک میکدہ میں انہیں شراب پلا دی حالانکہ انہیں ریڈیو سے رات کا بلیٹن پڑھنا تھا۔پنڈت
جی جب جھومتے جھامتے ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو ہندی خبروں کے صلاح کار ڈاکٹر نگیندر انہیں
دیکھ کر کسی قدر پریشان ہو گئے۔اس شام کچھ دیر پہلے ہی وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاں
کے قتل کی خبر آ گئی تھی۔خبروں کا وقت قریب آ چکا تھا۔اور اس وقت کسی متبادل نیوز ریڈر کا
بندوبست کرنا بھی ممکن نہ تھا۔لہٰذا مجبوراً پنڈت جی کو بلیٹن لے کر نیوز روم میں جانا
پڑا۔پنڈت جی نے جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالا اور کچھ ایسے اعتماد کے ساتھ لیاقت علی خاں
کے انتقال کی خبر نشر کی اور آواز میں کچھ ایسا سوز و گداز پیدا کیا کہ جب یہ خبریں پڑھ کر باہر
آئے تو ڈائریکٹر جنرل سے لے کر نیچے تک سب نے ان کے بلیٹن کی بے پناہ تعریف
کی۔یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر نگیندر کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس دن ان کی آواز میں
ایسا سوز و گداز اور ایسا اعتماد کیوں کر پیدا ہو گیا تھا۔

پنڈت جی نے ساری زندگی قلندری میں گزاری۔کبھی اپنی شہرت اور تعلقات کو

www.taemeernews.com

اپنے فائدہ کے لئے استعمال نہیں کیا۔ وہ زندگی بھر خبریں تو پڑھتے رہے۔ لیکن کبھی خود "خبر" بننے کی کوشش نہیں کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے کئی برس کنٹریکٹ پر کام کیا۔ اب کئی ٹی۔ وی سیریلوں میں کام کر رہے ہیں۔ "تمس" میں ان کی اداکاری کو عوام نے بے حد پسند کیا۔ دو تین آرٹ فلموں میں بھی کام کیا۔ پنڈت جی اب بھی کسی نہ کسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ دل تو ان کا اب بھی جوان ہے لیکن عملی زندگی میں ان کی سرگرمیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب وہ ہمارے پڑوس میں دہلی کی "آکاش بھارتی" بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں اپنی رفیقہ حیات یشودھا پانڈے کے ساتھ رہتے ہیں۔ بچے دہلی سے باہر رہتے ہیں۔ یشودھا پانڈے بھی اب ۶۵ برس کی ہو چکی ہیں اور اس بات سے کافی خوش رہتی ہیں کہ پنڈت جی اب اپنا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتے ہیں۔ جو آواز پہلے سارے برصغیر میں گونجا کرتی تھی اب اس کا دائرہ سمٹ کر آکاش بھارتی کے ایک فلیٹ میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ پنڈت جی اپنی زندگی سے خاصے مطمئن ہیں۔ کہتے ہیں "سماج کو جو کچھ میں دے سکتا تھا وہ میں دے چکا ہوں۔ اب دکھ کس بات کا۔ جب غالب خستہ کے بغیر دنیا کے کوئی کام بند نہیں ہوئے تو بھیا دیوکی نندن پانڈے کیا چیز ہے۔ بجز آواز کے میرے پاس تھا ہی کیا اور ہے بھی کیا۔"

(1995)

www.taemeernews.com

علی باقر

علی باقر کے بارے میں کچھ لکھنے کو دراصل میں اپنے بارے میں کچھ لکھنا تصور کرتا ہوں۔اس لئے کہ ہم دونوں کی دوستی کی عمر اب پاؤ صدی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔یہ دوستی وہاں سے شروع ہوتی ہے جب ہم دونوں کے 'آتش' نہ صرف جوان تھے، بلکہ ایک ہی یونیورسٹی کی ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے(یہاں یونیورسٹی سے مراد عثمانیہ یونیورسٹی ہے اور جماعت سے مراد بی۔اے ہے)ہم دونوں کے مزاج مشترک تھے۔مضامین مشترک تھے، دوست مشترک تھے اور حد ہوگئی کہ وہ لڑکیاں بھی مشترک تھیں جن کے حُسن پر ہم باری باری فدا ہوا کرتے تھے۔اس نازک معاملے میں بھی جب ''خیال خاطر احباب'' کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا تو اس دوستی کی پائیداری میں بھلا کیا شک ہوسکتا ہے۔

جون ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی، جب علی باقر سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی، اس خوش شکل، خوش مذاق، خوش خوراک اور خوش اخلاق نوجوان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ ایک پل بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا، نچلا تو وہ اب بھی نہیں بیٹھتا، مگر ان دنوں اس کی رگوں میں جیسے پارہ دوڑا کرتا تھا۔کبھی کسی پر جملہ چست کیا، کسی پر فقرہ پھینکا، کسی پر پھبتی کسی، کسی پر لطیفہ اچھال دیا۔غرض اس کی زندگی ایک لمبی اور کبھی ختم نہ ہونے والی ہنسی تھی۔جہاں تک مندرجہ بالا اوصاف حمیدہ کا تعلق ہے، بفضلِ تعالیٰ یہ مجھ میں بھی موجود تھیں بلکہ اس وقت کی عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو میں ''بدرجہ اتم'' موجود تھیں۔سوائے خوش شکلی کے میں علی باقر سے کسی میدان میں پیچھے نہ تھا۔اس زمانے کی عثمانیہ یونیورسٹی اردو شعر و ادب کے ماحول میں کمر کمر ڈوبی ہوئی تھی۔میاں علی باقر کا یہ حال تھا کہ بیت بازی کے مقابلے میں کھڑے ہوجاتے تو شعروں کے کشتوں کے پشتے لگادیتے تھے اور جیسا کہ اس زمانے کے استادوں کا طریقہ تھا وہ بیٹھے بیٹھے عش عش کرتے رہ جاتے تھے۔اس ہونہار بروا کے پات اتنے چکنے

www.taemeernews.com

تھے کہ ان پر سے بظاہر ہر سنجیدہ بات پھسل جایا کرتی تھی۔لیکن اس ہنسوڑ اور کھلنڈرے نوجوان کی شخصیت کے ایک گوشے میں بڑی سنجیدگی، وقار، تنظیم اور رچاؤ بھی تھا اور یہی گوشہ پھیل کر آج کا علی باقر بن گیا ہے۔

اگرچہ یونیورسٹی میں ہم گھنٹوں ادب پر بحث کیا کرتے تھے لیکن کبھی یہ خوف دامن گیر نہ ہوا کہ میاں علی باقر ایک دن کہانیاں بھی لکھیں گے۔میں نے بی۔اے تک اپنے آپ کو ''زیورِ تعلیم'' سے آراستہ کیا اور یونیورسٹی سے نکل آیا، مگر علی باقر نے اتنی تعلیم کو نا کافی سمجھا اور پڑھتے چلے گئے۔ایم۔اے کیا اور آکسفورڈ میں نہ جانے کیا کیا غیر ضروری تعلیم حاصل کی۔کچھ ملازمتیں کیں، دہلی میں رہے اور ایک دن چپ چاپ لندن چلے گئے۔پھر ایک خوشگوار صبح کو پتہ چلا کہ لندن جا کر وہ افسانہ نگار بن گئے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں جب تک ملک سے برآمد نہ کیا جائے، تب تک ان میں سے ''ادب'' بھی برآمد نہیں ہوتا۔علی باقر ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔میرے اور علی باقر کے ایک مشترک دوست تھے، جو انگریز، انگریزی اور انگلستان سے اتنے متاثر تھے کہ عام بات چیت میں بھی بی۔بی۔سی سے خبریں نشر کرتے تھے۔جب تک ہندوستان میں رہے انگریزوں کے گن گاتے رہے۔انگریزی تو بولتے ہی تھے، مگر انگریزی میں چلتے، بیٹھتے، کھاتے پیتے اور سوتے بھی تھے۔وہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں جب ہندوستان سے انگلستان گئے تو ہمیں یوں لگا جیسے ہندوستان پر سے برطانوی اقتدار کا اصل خاتمہ تو ان کے جانے کے بعد ہوا ہے۔برطانوی اقتدار کے تابوت میں وہ آخری کیل کی حیثیت رکھتے تھے۔مگر لندن جا کر وہ ایسے بجھے کہ سنا ہے کہ اب بی۔بی سی کی خبریں نشر کرنا تو کجا انہیں سنتے تک نہیں۔اب ان کا رخ الٹی کی طرف ہو گیا ہے۔علی باقر کا معاملہ جداگانہ تھا۔وہ انگریزی تو بولتا تھا مگر انگریزی میں چلتا پھرتا اور سوتا نہیں تھا۔اس کی جڑیں ہندوستانی معاشرے میں دور تک پیوست تھیں۔وہ یوروپ گیا تو اپنے ساتھ بطور سامانِ سفر اپنی مشرقی قدر اور اطوار کو بھی لے گیا اور چودہ برس کے بن باس کے بعد جب وطن واپس لوٹا تو تب بھی اس کا سامانِ سفر محفوظ تھا۔علی باقر نے زندگی کا یہ سلیقہ اپنے والد بزرگوار مولوی آفتاب حسین صاحب سے سیکھا

www.taemeernews.com

ہے۔خدا جنت نصیب کرے۔ایسے رکھ رکھاؤ والے آزاد خیال آدمی تھے کہ ہم لوگ بھی ان سے ملتے تو دل میں حسرت لے کر اٹھتے تھے کہ اے کاش ہمیں بھی جیتے جی ایسا ہی باپ مل جاتا۔

علی باقر نے شروع میں جب ایک افسانہ ''شراب اور شہد'' لکھا تھا تو بطور خاص خط لکھ کر اس غلطی کی جانب میری توجہ نہ صرف مبذول کرائی تھی بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ میں اپنی رائے سے اسے خبردار کروں۔رائے تو خیر میں کیا دیتا مگر اس کہانی کو پڑھ کر یہ یقین نہ آیا کہ یہ وہی علی باقر ہے جسے ہم نے یوروپ جاتے وقت وداع کیا تھا تو تب بھی یہ قہقہے لگا رہا تھا۔اس کی کہانی میں کچھ ایسا چھپا سا غم تھا،ایسی اچھوتی کسک تھی اور ایسا لطیف حزن تھا کہ میں حیران رہ گیا کہ علی باقر نے آخر یہ دولت اب تک کہاں چھپا رکھی تھی۔آدمی کو سمجھنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے،اس کا اندازہ پہلی بار ہوا۔

اس کے بعد علی باقر کی پے بہ پے کئی کہانیاں شائع ہوئیں۔علی باقر کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ پیشہ ور افسانہ نگار نہیں ہے۔ادب میں زندہ رہنے کی مصلحتوں اور تقاضوں سے بالکل ناواقف۔سوائے اپنے قریبی دوستوں کے اس نے کسی اور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں رائے نہیں پوچھی۔حالانکہ مصلحت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ناقدوں سے رائے پوچھی جائے اور اس کے بعد ضروری ہوا تو قریبی دوستوں کو زحمت دی جائے۔اس لیے کہ ادب میں پنپنے کی یہی باتیں ہوتی ہیں۔مگر اس کا ایک فائدہ علی باقر کے حق میں یہ ہوا کہ اس نے جب بھی کوئی کہانی لکھی تو سچی اور بے ساختہ کہانی لکھی۔ہماری طرح نہیں کہ ایک ایک ناقد کو سامنے رکھ کر ادب تخلیق کئے جا رہے ہیں۔اس اعتبار سے علی باقر کی کہانیاں ''خالص کہانیاں'' ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیاں سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں اور خوشبو بن کر ساری ذات میں مہکنے لگتی ہیں۔علی باقر کی بعض کہانیاں پڑھ کر میرا وجود کئی کئی دنوں تک معطر رہا۔علی باقر نے احساس کے اس اچھوتے پن کو نہ جانے کس طرح اتنے دنوں تک چھپائے رکھا تھا۔اس کا انداز بیان بھی بے حد انوکھا،بے ساختہ اور بے تکلف ہے۔چھوٹے چھوٹے فقروں اور بے ضرر سے جملوں کو اکٹھا کر کے وہ جذبے اور احساس کی ایک عالیشان

www.taemeernews.com

عمارت کھڑی کر دیتا ہے۔اس کے پیرایۂ بیان کو دیکھ کر بیا کے گھونسلے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ایسا اچھوتا اسلوب مجھے اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں کے ہاں دکھائی دیا۔

علی باقر کی اکثر کہانیاں یوروپ کے معاشرے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔وہ جب یوروپ کی کہر آلود فضاؤں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی باتیں کرتا ہے تو ان کے دکھ درد اور ان کی چھوٹی موٹی خواہشوں میں خود کو شامل کر لیتا ہے۔سارا یوروپ جیسے اس کے سینہ میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔وہ مشرق کے دیگر ادیبوں کی طرح ایک خاص عینک لگا کر یوروپ کے لوگوں کو نہیں دیکھتا۔بر اعظموں میں بٹے ہوئے سارے انسان یکساں ہیں۔صرف ان کے حالات اور پس منظر الگ الگ ہیں۔علی باقر کی کہانیوں کا بنیادی مسلک انسانیت اور انسانی رشتوں کو جوڑنے والا وہی جذبہ ہے جسے ہم محبت کہتے ہیں۔اس کی ہر کہانی چاہے وہ ''ہٹ دھرم'' ہو، ''کسک'' ہو یا ''پہلے عشق کی لذت''، انسان کے اسی آفاقی جذبے کی نمائندگی کرتی ہے۔اس کی دیس بدیس کی کہانیاں پڑھ کر دل میں کیا کیا ہوتا ہے، کتنی کلیاں چٹکتی ہیں، کتنے زخم سلگ اٹھتے ہیں، کتنے تارے اٹھتے ہیں، کتنے رنگ بکھر جاتے ہیں، یہ سب میں کیسے بتاؤں؟ آپ خود پڑھ کر دیکھ لیجئے۔اس کی فنکاری اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ چھوٹی سی بات میں بھی جذبے کی عظمت کو تلاش کر لیتا ہے۔اس کی کہانی ''تونل بابا'' جب میں نے پڑھی تھی تو کتنی ہی دیر غمگین رہا تھا۔اگر میں اس کہانی کو لکھتا تو اسے ایک لطیفے کی شکل میں بیان کر دیتا۔مگر علی باقر نے اس کہانی میں ایک انجانے غم کی وہ تہہ داریاں تلاش کی ہیں جو ایک سلیقہ مند اور وفادار ادیب ہی سے ممکن ہے۔

علی باقر کی ایک اور پہچان یہ ہے کہ وہ ہم سب کے بنّے بھائی یعنی سجاد ظہیر مرحوم اور محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کا داماد ہے۔مگر اس نے ادب میں اپنا مقام بنانے کے لئے اس آسان اور موثر رشتے سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔اس نے تو بس کھری کہانیاں لکھی ہیں، ادب میں مقام بنانے سے کیا مطلب؟ بنّے بھائی نے خود میرے سامنے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ علی باقر کو اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرنا چاہیئے۔مگر اس معاملے میں وہ ایسا لاپرواہ ثابت ہوا کہ بنّے بھائی کی زندگی میں ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ

www.taemeernews.com

کر سکا۔ (داماد چیز ہی ایسی ہوتی ہے) عملی زندگی میں وہ اب بھی ہر سنجیدہ بات کو ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ افسانوں کے اس پہلے مجموعے کی اشاعت بھی دراصل میرے پیہم اصرار اور تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ مگر میرے اصرار کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ مجھ سے ہی اس کتاب کا پیش لفظ لکھوا تا جسے میں اکثر "پس و پیش لفظ" کہتا ہوں۔ بھلا میں کس ہنر میں یکتا ہوں۔ اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے ثبوت مثالوں کے ساتھ دے کر اس سے کہا۔ "بھئی تم کسی بھاری بھرکم شخصیت سے کیوں نہیں لکھواتے؟"

بولا "میاں مجتبیٰ! ہم تو محبت کے دیوانے ہیں۔ وہی کریں گے جو محبت ہم سے کروائے گی" پھر آنکھ مار کر حسب دستور ٹھٹھا مارتے ہوئے بولا "یوں بھی میں نہیں چاہتا کہ میری کتاب کی وجہ سے تمہارے علاوہ کسی اور کی شہرت میں اضافہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ذرا تم بھی مشہور ہو لو۔ اب مان جاؤ، اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔"

شہرت اور محبت یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ پیش لفظ لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ سو بحالت مجبوری میں نے علی باقر کے افسانوں کے چلتے جھکڑ کے آگے اپنے اس پیش لفظ کا چھوٹا سا دیا جلانے کی جسارت کی ہے جس کے بارے میں یقین ہے کہ پہلے ہی افسانے کے جھونکے میں بجھ جائے گا۔ اس کے بعد میں اندھیرے میں رہ جاؤں گا اور آپ علی باقر کے افسانوں کی روشنی میں بہت دور تک چلے جائیں گے اور میں چاہتا بھی یہی ہوں۔

(1978)

www.taemeernews.com

وہاب عندلیب

وہاب عندلیب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب ہم دونوں سماج، زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم دونوں جوان تھے۔ کچھ محتاط لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دامن کو جوانی سے آلودہ کئے بغیر ہی زندگی کو پھلانگ جاتے ہیں۔ وہاب عندلیب بھی ان ہی لوگوں میں سے ہیں۔ یہ پچیس برس اُدھر کی بات ہے۔ ان دنوں کی یاد آتی ہے تو نہ صرف کلیجہ بلکہ سارا وجود منہ کو آجاتا ہے۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے۔ اگرچہ اپنی زندگی کے دامن میں کچھ بھی نہیں تھا مگر گمان یہ ہوتا تھا کہ سب کچھ اپنا ہے۔ سورج جیسے صرف ہمارے لیے طلوع ہوتا ہے۔ چڑیاں صرف ہمارے لیے چہچہاتی ہیں۔ قوس قزح ہمارے لیے آکاش میں رنگ بکھیرتی ہے اور موسم ہمارے لیے بدلتے ہیں۔ گویا ہم وہ محور تھے جس کے اطراف زمین گردش کرتی ہے۔ جوانی سے بھرپور زندگیاں ایسی ہی مسرور و مطمئن ہوتی ہیں۔ ہم لوگ عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں پڑھتے تھے۔ میں بی۔اے کے پہلے سال میں تھا اور وہاب عندلیب ایم اے کے پہلے سال میں۔ میری طرح ان کا تعلق بھی گلبرگہ سے تھا مگر کبھی ان سے گلبرگہ میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کر کے جب میں بی۔اے میں داخلہ حاصل کرنے کی غرض سے حیدرآباد پہنچا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ حیدرآباد میں کہاں قیام کیا جائے۔ اسی اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ وہاب عندلیب اور ان کے ساتھیوں نے گلبرگہ کے طلبا کی سہولت کے لئے ''گلبرگہ کاٹیج'' قائم کر رکھا ہے جس میں اشتراکیت کے اصولوں پر طلبا کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اشتراکیت اور گلبرگہ دونوں میری کمزوریاں رہی ہیں۔ اسی لئے میں نے فوراً گلبرگہ کاٹیج میں داخلہ لینے کی ٹھان لی۔ یہیں میری پہلی ملاقات وہاب عندلیب سے ہوئی۔

www.taemeernews.com

وہاب عندلیب سے ملنے کے بعد احساس ہوا کہ ان سے نہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھائی سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہاب عندلیب نے حلیہ ہی کچھ ایسا پایا ہے کہ وہ ہمیشہ خود اپنے ہی چھوٹے بھائی کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ پستہ قد، معصوم چہرہ، مختصر سے ہاتھ پاؤں، اسی تناسب کے کان، ناک اور آنکھیں۔ بالکل آدمی کا پاکٹ ایڈیشن معلوم ہوتے ہیں۔ ہر دم چہرے پر ایک کم سن بچے کی سی معصومیت یوں چھائی رہتی ہے جیسے ابھی دودھ کی بوتل کے لئے رو پڑیں گے۔ گلبرگہ کالج میں داخلہ کے سلسلے میں ان سے ملا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایم۔اے کے طالب علم ہیں۔ یوں بھی آدمی کی تعلیمی قابلیت اس کے چہرے پر تو چسپاں نہیں رہتی۔ لہٰذا میں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ پوچھ لیا تھا ''آپ کون سے ہائی اسکول میں پڑھتے ہیں؟'' میرے اس سوال کے باعث ان کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ جیسے میری بات انہیں ناگوار گزری ہو۔

وہاب عندلیب کی عمر کا پتہ صرف ان کی سنجیدہ باتوں سے چلتا ہے۔ ان دنوں کا ذکر چھوڑیئے، زندگی کے مزید پچیس برس گزر جانے کے بعد اب بھی وہ ہائی اسکول کے طالب علم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اب وہ استاد ہیں لیکن طلبا ان کے اطراف موجود ہوں تو ان میں استاد کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پچیس برس میں جب یہ نہیں بدلے تو اب آگے کیا بدلیں گے۔

گلبرگہ کالج میں دو سال ان کے ساتھ ایسے گزرے کہ دن رات ان کا ساتھ رہتا مگر لگتا تھا ہم دونوں قریب رہ کر دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات ہم دونوں کے مزاجوں کے فرق کی وجہ سے تھی۔ وہاب عندلیب ہر دم سنجیدگی، متانت اور بردباری کا پیکر بنے رہتے ہیں۔ آدمی جب فرشتہ بننے کی کوشش کرتا ہے تو اسی طرح مضحکہ خیز لگتا ہے۔

وہاب عندلیب ''گلبرگہ کالج'' کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے ذمہ کام یہ ہوتا تھا کہ ہر مہینہ ہم لوگوں سے تیس روپے لیں اور مہینہ بھر ہمارے کھانے کا بندوبست کریں۔ ان ہی تیس روپیوں میں وہ ہمارے قیام وطعام کا انتظام کرتے، گلبرگہ کالج میں آئے دن ادبی محفلیں آراستہ کرنے کے علاوہ ہم لوگوں کو وقتاً فوقتاً قرض دینے کا اہتمام بھی کیا کرتے

www.taemeernews.com

تھے۔تیس روپیوں میں خاصی آسائشیں فراہم ہوجاتی تھیں مگر ہم کبھی ان آسائشوں سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔کالج کے چالیس پچاس لڑکوں میں سے ہم چار پانچ لڑکے ایسے تھے جن کا کام ہر دم کالج کے منتظمین کے خلاف شکایت کرنا ہوتا تھا۔کبھی کھانے کی کوالٹی پر اعتراض ہورہا ہے،کبھی کالج کی صفائی کے بندوبست پر اعتراض ہورہا ہے۔مگر کالج کے دوسالہ قیام کے دوران کبھی وہاب عندلیب نے ہماری شکایتوں کا بُرا نہیں مانا۔

وہاب عندلیب کو دیکھ کر پہلے پہل پتہ چلا کہ ''صبر وضبط'' کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ دوستوں میں مشہور تھا کہ وہاب عندلیب کے صبر کا پیمانہ کبھی لبریز نہیں ہوتا۔اس پر میں کہتا ''اس میں قصور وہاب عندلیب کا نہیں ان کے صبر کے پیمانے کا ہے جس میں شاید سوراخ پڑ گیا ہے ورنہ یہ کوئی بات نہیں ہوئی کہ کسی آدمی کے صبر کا پیمانہ کبھی لبریز ہی نہ ہو'' ایسے صابر وضابط آدمی میں نے کم دیکھے ہیں۔ہم انہیں چھیڑتے،ان پر اعتراضات کرتے مگر اس کے جواب میں وہ ہماری طرف ایک خاموش سی مسکراہٹ پیش کردیتے تھے کہ گر قبول افتدز ہے عز وشرف۔ایسے آدمی کا کوئی کیا بگاڑ لے گا؟

۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء کی عثمانیہ یونیورسٹی کا ماحول اردو ادب اور ترقی پسندی سے عبارت تھا۔یہی وجہ تھی کہ ایک اچھا خاصا طالب علم جیسے ہی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا تھا وہ ادب کا پرستار اور بائیں بازو کے خیالات کا حامل بن جاتا تھا۔وہاب عندلیب اگرچہ فلسفہ کے طالب علم تھے لیکن ان کا زیادہ تر سروکار ادب سے تھا۔وہ اپنے اطراف ہر دم شعر وادب کا ماحول طاری کئے رہتے تھے۔کبھی شعر سنے جارہے ہیں تو کبھی سنائے جارہے ہیں۔اسی ناموافق ماحول کا نتیجہ تھا کہ وہاب عندلیب پر بھی شاعری کا جادو چل گیا اور وہ کچھ عرصے تک شاعری بھی کرتے رہے۔انہوں نے کچھ افسانے بھی لکھ رکھے تھے اور تنقیدی مضامین بھی۔ان دنوں ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوتا تھا۔اردوادب ہم لوگوں کی ذاتوں میں اس قدر سرایت کرگیا تھا کہ معاشیات اور سیاسیات کے پرچوں میں بھی میر اور غالب کے شعروں کے حوالے دیا کرتے تھے۔مجھے یاد ہے کہ ایک بار معاشیات کا ٹسٹ ہوا اور جب پرچے جانچ کے بعد واپس کئے جانے لگے تو معاشیات

www.taemeernews.com

کے استاد مولوی فخر الحسن نے مجھ سے کہا تھا ''میاں! تمہاری جوابی بیاض میں معاشیات اتنی کم اور میر اور غالب کے اشعار اتنے زیادہ ہیں کہ مجھے اس کی جانچ اردو کے کسی استاد سے کرانی چاہیے تھی، تاہم اگر جوابی بیاض میں تھوڑی سی بھی معاشیات ہوتی تو میں تمہیں سو میں سے دس نمبر دے کر یوں مایوس نہ کرتا'' پھر غالب کا ایک مصرعہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ میری طرف اچھالتے ہوئے بولے۔

؎ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ان دنوں کے ماحول پر شعر و ادب کا دبدبہ اس قدر طاری تھا کہ نثر میں بات کرنا تقریباً ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ کسی واقعہ، خبر یا سانحہ پر تبصرہ کرنا ہوتا تو فوراً کسی شعر کا سہارا لے کر تبصرہ کو ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔ روزمرّہ زندگی پر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کا گمان ہوتا تھا۔ ایسے ماحول میں وہاب عندلیب کو بھی گمراہ ہونا تھا۔ سو وہ ہوئے اور اب تک گمراہ ہیں۔

اگرچہ ہم لوگ سوشلزم اور کمیونزم میں یقین رکھتے تھے لیکن ہمارے سوشلزم کی خرابی یہ تھی کہ اسے ہم نے صرف مخدوم، فیض، ساحر، کیفی اعظمی اور سردار جعفری کی نظموں اور کرشن چندر کے افسانوں سے اخذ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاب عندلیب صبح اٹھتے ہی بڑی عجلت کے ساتھ اپنے کمرہ کا دروازہ کھول کر دیکھ لیا کرتے تھے کہ کہیں ملک میں وہ انقلاب تو نہیں آ گیا جس کا ہم سب کو انتظار تھا۔ اپنی افتادِ طبع کے باعث وہ انقلاب کی آمد کے لیے ہم سے زیادہ بے چین رہا کرتے تھے۔ اسی لئے وہ انقلاب کی آس میں پانچ بجے ہی اٹھ جاتے تھے۔ میرا کمرہ ان کے کمرہ کے برابر تھا۔ چوں کہ میں دیر سے اٹھنے کا عادی تھا اسی لئے سونے سے پہلے وہاب عندلیب سے کہہ دیا کرتا تھا کہ ''بھئی! اگر کسی دن واقعی انقلاب آ جائے تو مجھے بھی جگا دینا۔'' یہ نوبت کبھی نہیں آئی۔ مگر ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ وہ صبح میں جلدی بیدار ہونے کے عادی ہو گئے، اور اب تو یہ انقلاب ماضی کی داستان بن گیا ہے۔ ممکن ہے نئی نسل کو اب بھی اس انقلاب کی آمد کا انتظار ہو مگر ہماری آنکھیں تو اس کے انتظار میں پتھرا گئیں۔ زندگی اپنے سفر میں آدمی سے کتنے اچھوتے خواب چھین لیتی ہے۔

www.taemeernews.com

وہاب عندلیب کو میں پچیس برس سے جانتا ہوں اور اس لمبے عرصے میں، میں نے یہی دیکھا کہ وہ ادب کی خاموش خدمت کرنے کے قائل ہیں۔ یہ ادب کی خدمت کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ یوں لگتا ہے جیسے ادب کی خدمت نہ کر رہے ہوں، کوئی گناہ کر رہے ہوں۔ یہ ادب کی سچی خدمت کی انتہا ہے۔ گلبرگہ کالج کے زمانے میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہوگا جس میں وہاب عندلیب نے کوئی ادبی محفل آراستہ نہ کی ہو۔ کبھی "شب افسانہ" منائی جارہی ہے۔ کبھی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ کبھی بیت بازی کا مقابلہ ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اتنا سب کچھ کر کے وہ محفل میں کبھی نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ایسی ادبی محفلوں کے بعد عموماً تصویریں کھنچوائی جاتی تھیں لیکن وہاب عندلیب تصویر کشی کے موقع پر بھی سب سے پیچھے کھڑے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ غالباً وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ گمنامی ان کا مقدر رہے۔

پھر گلبرگہ کالج کی وہ خوب صورت محفل اجڑ گئی، ہم سب زندگی کے سفر میں اپنے اپنے راستوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ کتنے دوست ایسے ہیں جن سے گلبرگہ کالج سے نکلنے کے بعد پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ مگر وہاب عندلیب اب بھی ماضی کے سارے دوستوں سے "رسم وفاداری" نبھائے جا رہے ہیں۔ انہیں خط لکھیں گے، ان کا حال پوچھیں گے، ان کی خیریت دریافت کریں گے۔ دوستوں کی خوشی اور ان کی کامیابی پر یوں خوش ہوں گے جیسے یہ خوشی اور یہ کامیابی ان ہی کے حصے میں آئی ہو۔

وہاب عندلیب اس نظریہ کے قائل ہیں کہ آدمی سے ایک بار تعلق قائم ہو جائے تو پھر اس تعلق کو آخری سانس تک برقرار رہنا چاہیے۔ پچھلے بائیس برسوں میں ہم دونوں کبھی ایک شہر میں نہیں رہے۔ لیکن انہوں نے دوستی کے تعلق کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس تعلق کو وہ بذریعۂ ڈاک اور بذریعۂ عمل زندہ رکھنا جانتے ہیں۔ میں خطوں کے جواب دینے کے معاملے میں خاصا کاہل واقع ہوا ہوں۔ مگر وہ پابندی سے خطوط لکھتے اور خطوط کے جوابات دیتے رہتے ہیں حالانکہ میرا حال جاننا ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس طرح وہ اپنے

www.taemeernews.com

جذبۂ دوستی کو تسکین پہنچانا چاہتے ہیں۔اسی دوستی کے تعلق کو بنائے رکھنے کے لئے وہ کتنی ہی بار مجھے زبردستی اپنے آبائی گاؤں لے گئے اور مہمان نوازی کے پُر جوش مظاہرے کئے۔

جب میری پہلی کتاب "تکلف برطرف" چھپی تو وہاب عندلیب یوں خوش ہوئے جیسے یہ کتاب میری نہیں ان کی ہے۔اسی بہانے انہوں نے گلبرگہ میں میرے خیر مقدم کا اہتمام کیا۔میرا یوں خیر مقدم کیا جیسے میں ادیب نہیں کوئی سیاسی لیڈر رہوں۔شاید ہی کسی ادیب نے "سیاسی خیر مقدم" کے مزے لوٹے ہوں۔اس کے بعد سے انہیں ادیبوں کے "خیر مقدم" کروانے کی عادت سی پڑ گئی۔انواع واقسام کے ادیبوں کے خیر مقدم انہوں نے گلبرگہ میں کروائے۔لطف کی بات یہ کہ وہ ایک ادیب کا "خیر مقدم" ایک ہی مرتبہ کرنے کو کافی نہیں سمجھتے۔پچھلے پانچ برسوں سے میں دہلی میں ہوں لیکن اس کے باوجود وہ اس عرصے میں دومرتبہ گلبرگہ میں میرا خیر مقدم کروا چکے ہیں۔اب تو حیدرآباد جاتے ہوئے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں گلبرگہ میں میرا خیر مقدم نہ ہو جائے۔

وہاب عندلیب کی سب سے بڑی کمزوری گلبرگہ ہے۔گلبرگہ کے لئے وہ یوں مچلتے ہیں جیسے بچہ کھلونے کے لئے مچلتا ہے۔دوسال پہلے وہ میرے دفتر "نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ" کے ایک تربیتی پروگرام میں شرکت کے لئے دہلی آئے۔ایک مہینے تک ان کا ساتھ رہا۔گلبرگہ سے انہیں صرف ایک مہینے کے لئے دور رہنا تھا مگر وہ اس ایک مہینے میں "ہجر" کی ساری منزلوں سے گزر چکے تھے۔ٹریننگ کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت گلبرگہ کے احباب کو خط لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ہر دوست کو خط لکھ کر گلبرگہ کی خیریت دریافت کرتے تھے۔پوچھتے کہ میرے بعد گلبرگہ کا کیا حال ہے؟۔کیا میرے بعد بھی سورج وہاں پابندی سے نکل رہا ہے؟ کیا چاند اب بھی وہاں راتوں کو جگمگاتا ہے؟ کیا ستارے اب بھی ٹمٹماتے ہیں؟ کیا ہوائیں اب بھی پابندی سے چلا کرتی ہیں؟ گلبرگہ سے ان کے معصوم عشق پر مجھے ہنسی آجاتی ہے۔

وہاب عندلیب کی ہر دم یہ کوشش ہوتی ہے کہ ادب کے نقشے میں گلبرگہ نمایاں رہے۔ادب کے نقشے میں گلبرگہ کو نمایاں کرنے کے لئے وہ انواع واقسام کی سرگرمیوں

www.taemeernews.com

میں مبتلا رہتے ہیں۔ ادبی انجمنیں بناتے ہیں، ادبی محفلیں آراستہ کرتے ہیں، مشاعرے کرواتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ ادبی رسالے نکالنے سے بھی باز نہیں آتے۔ رسالے شائع کرنا ان کی پرانی عادت ہے۔ گلبرگہ کالج کے زمانے میں بھی وہ ایک ادبی رسالہ ''انسان'' کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ ابھی حال میں انہوں نے گلبرگہ کے چند احباب کو جمع کرکے ''زاویے'' کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا ہے جسے ادبی حلقوں نے خاصا سراہا ہے۔

ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا انہیں خاص ملکہ ہے اور یہیں آکر میں ان کی ہر دل عزیزی کا قائل ہو جاتا ہوں۔ شاعروں اور ادیبوں کی مخلوق وہ عجیب و غریب مخلوق ہوتی ہے جسے کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ مینڈکوں کو ایک پنسیری میں رکھنے میں جو دشواری ہوتی ہے اتنی ہی دشواری ادیبوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں پیش آتی ہے مگر وہاب عندلیب یہ مشکل کام بھی آسانی سے کر جاتے ہیں۔ اصل میں وہاب عندلیب کی ذات وہ پلیٹ فارم ہے جہاں سارے ادیب جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہاب عندلیب کے خلوص اور محبت کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔

ادھر کچھ برسوں سے وہاب عندلیب نے اپنے دوستوں کے خاکے لکھنے کی جانب توجہ کی ہے۔ ''قامت و قیمت'' میں شامل سارے خاکے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ان خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ لکھنے والے کے خلوص کی کارفرمائی نظر آجاتی ہے۔ خاکہ نگاری کے تعلق سے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ خاکہ نگار جب کسی کا خاکہ لکھتا ہے تو صرف اس شخصیت کا خاکہ نہیں ابھرتا جس کا کہ خاکہ لکھا جا رہا ہو، بلکہ اس طرح خود خاکہ لکھنے والے کا خاکہ بھی پس منظر میں انجانے طور پر ابھر آتا ہے۔

''قامت و قیمت'' کے خاکوں کو پڑھ کر آپ خاکہ نگار کے بارے میں یقیناً یہ رائے قائم کریں گے کہ ان خاکوں کا لکھنے والا ایک مخلص، دیانت دار اور سچا آدمی ہے۔

(1997)

☆☆☆

www.taemeernews.com

مجتبیٰ حسین کے بارے میں تحقیقی مواد

مجتبیٰ حسین کا فن : پروفیسر شکیل الرحمٰن :2010 ایم آر پبلی کیشنز،10 ،میٹرو پول مارکٹ،کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۔110002

مجتبیٰ حسین نمبر ماہنامہ شگوفہ : نومبر 1987 ، ایڈیٹر : ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، 31 بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۔500001

مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار : سردار پاشاہ 1996 ،گلبرگہ

خصوصی مجلہ : جشن مجتبیٰ حسین منعقدہ شارجہ : 1997 ، آرٹس پروموشن بیورو، شارجہ (یو اے ای)

مجتبیٰ حسین اور فن مزاح نگاری : حسن مثنیٰ ، 2003 ، ایلیا پبلی کیشن ، دہلی ۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ،9 گولہ مارکٹ ، دریا گنج، نئی دہلی ۔110002

مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار : ڈاکٹر افسر کاظمی ، 2004 ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ، 9 گولہ مارکٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔110002

مجتبیٰ حسین (فن اور شخصیت) : خصوصی شمارہ ''کتاب نما'' مرتبہ :ڈاکٹر محمد کاظم 2004 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

مجتبیٰ حسین ۔ ایسا کہاں سے لاؤں : پروفیسر شفیع شیخ ، 2005 سیفی بک ایجنسی ،53 ابراہیم رحمت اللہ روڈ ، 11 ، امین بلڈنگ ، ممبئی ۔400003

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری : پیرزادہ ارشاد احمد ، 2007 رام پورہ باندی پورہ ، کشمیر

www.taemeernews.com

مجتبیٰ حسین اورگلبرگہ : مرتب: احسان اللہ احمد، 2008 انجمن ترقی اردو ہند، گلبرگہ، اسٹیشن روڈ گلبرگہ (کرناٹک)

اردو ادب کے تین بھائی : مرتب: رفیق جعفر، 2008 حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، 2390، خان بہادر ہدایت اللہ روڈ، اعظم کیمپس، پونے 411001

مختلف رسالوں، ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد ☆ 'الفاظ' علی گڑھ ☆ ماہنامہ 'انشا' کولکتہ ☆ ماہنامہ 'شاعر' ممبئی ☆ ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد ☆ ماہنامہ 'عد سہ' حیدرآباد ☆ سہ ماہی 'الانصار' حیدرآباد کے علاوہ روزنامہ 'جنگ' کراچی ☆ روزنامہ 'آزاد ہند' کولکتہ ☆ روزنامہ 'جنگ' لندن ☆ روزنامہ 'آفتاب' بھوپال ☆ روزنامہ 'منصف' حیدرآباد کے خصوصی گوشے۔

☆☆☆